بلیک باس

از

رفعت سراج

اسکینگ: chillimilli

کوجلی کا دوسرا جنم لگتا ہے مجھے تو۔ وہ فریج میں سر دیے غالبا ٹھنڈی بوتل ٹٹول رہی تھی۔ وہیں سے جملہ آیا تھا۔

ارے خدا کا خوف کرو۔ اس طرح منہ بھر بھر کر خلق خدا کو نام نہیں دھرتے۔ سب اللہ کے بنا بندے ہیں گورے یا کالے۔ اماں جان تخت پر چندیاں پھیلا غالبا کسی آنے والی یا والے کے ملبوسات کی تیاری میں بری طرح مگن تھیں، مگر اسے اللہ سے ڈرانے کی مہلت انہوں نے اس مصروفیت میں نکال ہی لی تھی۔

آپ کس کونے سے مسلمان ہوتی ہیں؟ ابھی تک دوسرے تیسرے جنم میں اٹکی ہوئی ہیں۔ مودی نے بھی اس کی جھاڑ پونچھ میں اپنا رول ادا کیا۔

استغفر اللہ۔ اور جو کوئی حبشی پلے پڑ گیا تو کیا محترمہ زہر کھالیں گی؟ وہ اپنے طوطے کو چوری ڈالتا ہوا بڑے منہمک انداز میں پوچھ رہا تھا۔

اول تو کسی حبشی کی یہ مجال نہیں۔ اور جو خدانخواستہ یہ براوقت آیا تو واقعی زہر کھالوں گی۔

اس نے پانی گلاس میں ڈالتے ہو نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

لڑکی دانتوں تلے زبان داب کے بھی رکھا کرو۔ اماں جان نے ڈپٹ دیا۔ نوج۔ زہر کھا گی۔۔۔۔ اتنا گمان۔۔۔ اور جو ہم شکل سے بیشکل ہو جائیں، تو کیا تو ہمیں اٹھا کر گھر سے باہر پھنکوادے گی۔ خبر دار۔

بس مجھے اچھے نہیں لگتے کالے لوگ۔ توبہ دیکھ کر۔

اماں جان نے پاس پڑی ہوئی چپل جھک کر اٹھائی۔

بول آگے۔ گن کر دس جوتے نہ لگا تو۔

بس اماں جان۔ اتنا مختصر اسکور؟ جب کہ افروایشین آجادی کی تعداد اربوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اربوں انسانوں کا دل دکھانے کی اتنی سی سزا؟

مودی کن انکھیوں سے اسے دیکھ کر چڑا رہا تھا۔ بظاہر اپنے طوطے میں مگن تھا۔

آپ کو تو موقعہ ملنا چاہیے جلے پھپھولے پھوڑنے کا۔ اونٹ کہیں کے۔ اس نیوتل واپس فریج میں رکھتے ہوزور سے دروازہ بند کیا۔۔

جب کہہ دیا کہ نہیں اچھے لگتے ہمیں۔

پھر بولی۔اماں جان نے چشمے کی بالائی سرحدوں سے گھورا۔

ہونہہ۔وہ پاؤں پٹختی برآمدے سے باہر چلی گئی تھی۔

اللہ برے وقت سے بچا۔انسان بڑا نوالہ کھا لے بڑا بول نہ بولے۔کم عقلی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔اماں جان کو تازہ بلیٹن کے لیے خاصا مواد مل گیا تھا۔

آپا۔کمال بھائی آ ہیں۔ذکی نے دروازہ تھپتھپا کر اطلاع دی۔

پھر میں کیا کروں۔اماں جان کو بتاؤ۔وہ شو بزنس سے متعلق کوئی میگزین نہایت توجہ سے دیکھ رہی تھی۔اسے کمال کی آمد اور ذکی کی مداخلت نہایت زہر لگی تھی۔

اماں جان۔باتھ روم میں ہیں۔یقیناً آدھا گھنٹہ وہ وہاں ضرور گزاریں گی۔مجھے نہیں پتا، میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔اب آپ جانیں اور اماں جان۔وہ واپس ہو گیا۔

بڑا آیا فرض کا لگتا۔ایک انہیں کوئی کام نہیں جب دیکھو منہ اٹھا چلے آ رہے ہیں۔وہ سر سے پاؤں تک کڑوی ہو رہی تھی۔

بھا گیا شری کے خوبصورت کلوز اپ اور شاندار ڈریسز سے نظریں ہٹا کر ایک سانولے

سلونے مہمان کی میزبانی کرنا ایک جانگسل مرحلہ تھا۔

وہ میگزین سینے سے لگا لگا باہر آ گئی۔

السلام علیکم اس نے گویا لٹھ دے مارا۔

وعلیکم السلام۔کمال نے گلابی کپڑوں میں ملبوس اپنی گلابی سی کزن کو بھرپور دلچسپی سے دیکھا۔

کیا ہو رہا ہے؟ وہ مسکراا۔

پیارے پیارے لوگوں کی تصویریں دیکھ رہی تھی۔کہ۔اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

کہ پیارے پیارے لوگ خود چل کر آ گئے۔وہ شرارت سے مسکرایا۔

اللہ رے خوش فہمی، کمال بھائی ایک بات کہوں مائنڈ مت کیجیے گا۔

ارشاد۔

اپ اتنی سخت گرمی میں باہر نہ نکلا کریں۔

اف اس قدر ہمدردی، وجہ؟ وہ مسکرایا۔

اور کالے ہو جائیں گے۔ وہ تیزی سے بولی۔

کمال نے قہقہہ لگایا۔ بھئی ہمارے گن بڑے گورے ہیں۔ روزانہ دو تین پرپوزلز آجاتے ہیں۔

ان کی آئی سائٹ ویک ہوگی۔ وہ جل کر بولی۔

ارے بڑے بڑے آہو چشم ہمارے طلب گار ہیں۔ اس نے پھر چڑایا۔

ان کو پیسے ملتے ہوں گے۔ وہ آرام سے گویا ہوئی۔

کس بات کے؟ کمال واقعی نہیں سمجھا۔

آپ کو بیوقوف بنانے کے۔ وہ کھی کھی کر کے ہنس پڑی۔

پھر بھی اس سے ہماری ہی اہمیت ثابت ہو رہی ہے۔ لوگوں کا روزگار لگا ہوا ہے، ہماری

وجہ سے۔

وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھا۔

وہ زچ سی ہوگئی۔

ارے بھئی۔ آج کل تو ہم پر گیت لکھے جا رہے ہیں۔ کیا بات ہے ہماری۔ کالا سیاہ، کالا میرا کالا اے دلدار۔

وہ میز کو طبلے کی طرح بجا کر گنگنانے لگا۔

ہونہہ۔ اس کی تو جان ہی جل کر رہ گئی۔

اچھا بتائیے۔ آپ کیا زہر مار کریں گے؟ وہ بہت بدلحاظی سے پوچھ رہی تھی۔

بھئی، زہر مار کرنے کے لیے تو آپ ہی کافی ہیں۔ پھیکا شلجم۔ یا پھر۔ جیسے بغیر نمک کا سالن یا پھر پلاسٹر آف پیرس کا بیترتیب ڈھیر۔ ان بجھا چونا، کڑوا زہریلا۔ ہاہا۔ وہ اسے جز بز ہوتا دیکھ کر قہقہہ لگا بیٹھا تھا۔

ہونہہ۔ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے ظاہر ہے یہی کہیں گے۔ اور وہاں پرسوں تائی امی سنا

ہے آپ کے لیے لڑکی دیکھنے گئی تھیں۔ بتایئے کس بیچاری کے نصیب۔۔۔۔؟

وہ شریر انداز میں کہتے کہتے رک گئی۔

بہت ساری ہیں لائن میں۔۔۔سوچوں گا۔ کوئی ایک تو نہیں بعض نے تحریری ایپلیکیشن بھجوائی ہیں۔ وہ شان استغنا سے گویا ہوا۔

ارے کمال آیا ہے۔ اتنے دنوں میں آ، خیر تو ہے؟

اماں جان کی آمد نے اس کا منہ بند کر دیا۔

یہ لیجیے۔ آپ سب گھر والے ایک بات پر متفق ہی نہیں، چاند تو کہہ رہی ہیں روز آتا ہوں۔ تنگ آ گئے ہیں آپ لوگ، ابھی آپ کے آنے سے قبل بیبھاؤ کی، سنائی ہیں مجھے۔

اماں جان نے پلٹ کر اسے گھورا۔

تمہارے سر پر بیٹھتا ہے، تنگ آ گئی میں تمہاری بدلحاظی سے۔ سوچ سوچ کر ہولتی ہوں۔ دوسرے گھر تمہارا گزارا کیسے ہوگا؟ جوتے کھاتی ہیں لڑکیاں گز بھر کی زبان کے ساتھ۔ کام پیارا ہوتا ہے چام نہیں۔

میرا بچہ لاکھوں میں ایک وردی والے سلامی دیں گے۔ انشاءاللہ۔ نتیجہ آ گیا بیٹا؟

اماں جان ڈانٹ ڈپٹ کرتے کرتے حالات حاضرہ پر آ گئیں، وہ اس کی سی ایس ایس کے رزلٹ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔

جی۔ بلکہ پرانا ہو گیا۔

ارے تو تم نے بتایا کیوں نہیں۔ ہوا کیا؟ اماں جان کو اپنی بیخبری پر جیسے تاسف ہوا۔

وہی جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے وہی جس کی وجہ سے ہمیں لوگوں کی جیلسی کا سامنا ہے۔

وہ بدستور دل جلانے والے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اور واقعی چاند کی جان بھی جل رہی تھی۔

تم اتنی دیر سے بیٹھی ہوئی ہو۔ جاؤ کچھ لے کر آؤ۔ دیکھ نہیں رہیں، کتنی گرمی میں آیا ہے۔

اماں جان نے سرزنشی انداز میں اسے گھورتے ہو کہا۔

تو کہا کس نے تھا؟ وہ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اماں جان کا خون کھول گیا تھا۔مگر کمال پر کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا تھا۔

مغرب کی نماز وہ جھت پر پڑھتی تھی۔اور اس کے بعد اپنی اسٹڈی کرتی تھی۔

آج سارا دن صفائی ستھرائی میں گزرا تھا۔گھر میں کوئی تھا بھی نہیں۔اماں جان کمال کی طرف گئی ہوئی تھیں۔

کمال کے والد سالار مصطفیٰ اور چاند کے والد سردار مصطفیٰ دونوں حقیقی بھائی اور اماں جان کی اولاد تھے۔ان کے علاوہ اماں جان کی تین بیٹیاں تھیں۔

سردار صاحب کی تین اولادیں تھیں۔سب سے بڑا محمود عرف مودی۔اس سے چھوٹی چاند اور چاند سے چھوٹا ذکی۔سالار صاحب کے صرف دو بیٹے کمال اور نعمان۔

چاند کی والدہ ذکی کی پیدائش کے وفات پا گئی تھیں اس لیے ان بچوں کی پرورش ان کی دادی یعنی اماں جان نے کی تھی۔اور وہ برسوں سے اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ ہی رہ رہی تھیں۔

جب بچوں کی عمریں چھوٹی تھیں۔اس وقت انہوں نے سردار مصطفیٰ پر دوسری شادی کے لیے خاصا دباؤ ڈالا تھا۔

ان کی بیگم چونکہ ان کی پسند اور چاہ کی تھیں۔شاید اسی لیے ان کا ذہن دوسری عورت کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہو سکا تھا۔اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے واضح طور پر دوسری شادی سے انکار کر دیا تھا۔گویا اماں جان ہی ان بچوں کی ماں بھی تھیں۔

بمشکل اپنے دھندے نمٹا کر وہ چھت پر آئی۔ٹھنڈی ہوا اور کھلی فضا نے طبیعت میں فورا بشاشت پیدا کی۔کافی دیر تک تو کتاب کھولنے کو جی ہی نہ چاہا۔

دل چاہا اس خوبصورت اور پرسکون ماحول میں یونہی ٹہلتی رہے۔

معا نیچے سے کال بیل کی آواز سنائی دی۔

اف۔

نیچے اترنا اور پھر حبس سے پر ماحول میں واپس جانا سوچ کر ہی کوفت ہوئی۔

اس نے چڑے ہوا انداز میں نیچے جھانکا۔

ہا۔ساری کوفت مسرت میں بدل گئی۔

اوپر کی فضا میں گھٹن۔

اور نچلے حصے میں ٹھنڈک۔

آناً فاناً احساسات بدل گئے تھے۔

وہ تقریباً جست لگاتی ہوئی نیچے آئی تھی۔فوراً گیٹ کھولا۔

آداب عرض ہے۔وہ خوش کن تاثرات سے سجے چہرے کے ساتھ کہہ رہی تھی۔اور ایک طرف ہٹ گئی تھی۔

کیا بات ہے بہت خاموشی ہے۔؟وہ راہداری میں چلتے ہو پوچھ رہا تھا۔

سب گئے ہو ہیں اپنے دھندوں پر۔بابا اور اماں جان تایا ابو کی طرف گئے ہو ہیں۔اماں جان صبح سے گئی ہوئی ہیں۔بابا انہیں لینے گئے ہو ہیں۔

اس نے نہایت تفصیل سے جواب دیا اور اسے لے کر لاؤنج میں چلی آئی۔

وہ چوری چوری اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

انتہائی خوبصورت امپورٹڈ آسمانی شرٹ ور بلیو پینٹ میں ملبوس اپنے رکھ رکھاؤ کے ہمراہ وہ نہایت جاذب دکھائی دے رہا تھا۔

بروٹ کی مخصوص مہک جو اس کی آمد کے ساتھ وابستہ تھی جیسے گھر کی فضا میں رچ گئی تھی۔

اور یوں۔

جیسے وہ گھر کے کونے کونے میں جذب ہو گیا تھا۔

درودیوار،اس کا ذکر کرتے محسوس ہو رہے تھے۔

وہ کہ خوشبو کی صورت ہر سمت پھیلا ہوا تھا۔

کیا ہو رہا تھا؟

وہ کرسی پر بیٹھتے ہوا پنے مخصوص پراعتماد اسٹائل میں اس کی سمت بغور دیکھتے ہو پوچھ رہا تھا۔

اسٹڈی۔ وہ نظریں جھکا کر بولی۔ 0اف کوئٹہ کی آب و ہوا نے تو انہیں بالکل گلابی ہی بنا دیا ہے(

بھئی وائنڈ اپ کرو تم نے تو بہت کام پھیلا لیا ہے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

چاند کا دل دھک کرنے لگا۔

وہائٹ اور گرین پرنٹ کے سوٹ میں خوب اونچی سی پونی ٹیل بنا بیحد پیاری لگ رہی تھی۔ ہاف آستین کی شرٹ سے سفید سفید بازو روشنی کی طرح چمکتے ہو محسوس ہو رہے تھے۔

گرمیوں میں وہ ہلکی سی جیولری استعمال نہیں کرتی تھی۔ حتی کہ چھوٹے سے ٹاپس بھی کانوں میں نظر نہیں اتے تھے۔ ہاتھ ناک، کان ہر قسم کی آرائش سے آزاد نظر آتے تھے۔

اتنی سادگی اور بےتکلف حلیے میں بھی وہ رگ جاں میں اترتی محسوس ہوتی تھی۔

اماں جان اسے سہل انگاری سے تعبیر کرتی تھیں۔

بقول ان کے۔ اپنی جان کو حد سے زیادہ آرام دینے کی عادت ہے۔ اور اعلا درجے کی نازک مزاجی۔

اچھا بتایئے کیا بناؤں۔ ٹھنڈا۔ گرم۔؟ وہ اس کی نظروں سے بچتے ہو پوچھنے لگی۔

اس کی گرم نگاہوں سے اس کی ساری خود اعتمادی زائل ہو جاتی تھی۔

دل ہمیشہ تمنا کرتا تھا کہ وہ آ۔

اور جب وہ آ جاتا تو اس اس کے سامنے بیٹھتے ہو گھبراہٹ سی محسوس ہوتی تھی۔

ٹھنڈا پلایئے جناب پھر اس کے بعد کھانا کھلایئے۔

پھر کوئی معقول سا بہانہ سوچیے اور ہمیں بتایئے تاکہ ہم کھانے کے بعد زیادہ دیر ٹھہر سکیں۔

وہ شریر انداز میں براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہہ رہا تھا۔

اس کی پیشانی پر موتی چمکنے لگے۔

جب ہی تو کہہ رہے ہیں وائنڈ اپ کیجیے اپنے کام۔۔۔ کوفت ہوتی ہے ان پابندیوں اور بہانوں سے۔

اس کی گھمبیر آواز اور معنی خیز لہجہ، اس کے وجود میں تلاطم برپا ہونے لگا۔

ابھی آئی۔

وہ اسکوائش کی تیاری میں مشغول تھی کہ بیل بجی گیٹ کھولا تو سامنے ذکی تھا۔

ہوگیا آپ کا کھیل ختم۔مغرب کی نماز بھی گول۔س کو بتاؤں گی۔اس نے فوراً ہی اس کی خبر لی۔

آپ تو اچھی آپا ہیں۔وہ اس کے گلے میں بازو ڈال کر خوشامدانہ انداز میں گویا ہوا۔

س آ گئیں؟اس نے آہستہ سے پوچھا۔

نہیں آئیں تو کیا ہوا،ابھی آتی ہوں گی۔تبریز ہیں اندر۔اس نے اطلاع دی۔

ارے تبریز بھائی۔وہ سنتے ہی اندر لپکا تھا۔

جلو اچھا ہوا،ذکی آ گیا۔کم از کم تبریز اب احتیاط تو کریں گے۔

جی چاہتا ہے کہ وہ سامنے رہیں،مگر ان کے بیتکلفانہ انداز سے دل گھبراتا ہے۔

وہ ٹرے اٹھا لاؤنج کی طرف آتے ہوسوچ رہی تھی۔

تبریز عارضی طور پر ترکی سدھارنے لگا تو جانے سےپہلے اس نے چاند کو پرپوز کر دیا۔

اف کتنے رنگ بکھر جاتے ہیں عورت کی زندگی میں۔

جب اسے اپنے من چاہے مرد کی طرف سے چاہت کا اعتبار و ثبوت ملتا ہے۔

وگرنہ بیاعتباریوں اور بیوفائیوں کے قصے سن سن کر چاہنے والے واہموں اور خدشات کے گرداب میں ہی الجھے رہتے ہیں۔

محبت کی الواہی مسرت کا اگلا موڑ ایک انجانا سا خوف ہوتا ہے۔

کہ جس کے تصور سے زندگی رنگین ہے۔

کہ جس کے بغیر زندگی وبال

اور ہر کار۔محال ہے۔

کہیں کھو نہ جا۔

بدل نہ جا۔

بھٹک نہ جا۔

چھن نہ جا۔

کہیں ایسا نہ ہو جا۔

کہیں ویسا نہ ہو جا۔

اس کی حسن پرست طبیعت کو ایک گونا قرار سا آ گیا تھا۔

زندگی کو عجب سا سکون کا گہرا احساس میسر آیا تھا۔ایک نامعلوم خوف سے جان چھوٹی تھی۔

وہ اپنے اردگرد صرف خوبصورت اشیاء وانسانوں کو دیکھنا پسند کرتی تھی۔

ذہن کی نزاکت کو ناگوار احساس دیے والی ہر شے سے اسے الرجی تھی۔

تبریز۔مردانہ حسن کا شاہکار۔

نہ جانے کتنے دلوں کی تمنا۔

کتنی آنکھوں کا خواب۔

نہ جانے کس کس کی بیقرار دعا۔

منتخب ہونے کے غرور نے اسے کسی ان دیکھی جنت میں پہنچا دیا تھا۔

البتہ ایک الجھن اسے لاحق ہوگئی۔

اس کا رزلٹ آ چکا تھا،گریجویشن کے بعد آگے پڑھنا اس کا مقصد کبھی بھی نہیں رہا تھا۔

اب تبریز نے اسے سال بھر کے انتظار کی سولی پر لٹکا دیا تو جیسے وقت رکا ہوا محسوس ہوا۔

بابا جان۔ایک شام باپ کو مناتی پائی گئی۔

بہت شاندار سی فرم میں بہت آرام دہ جاب ہے۔کرلوں؟

کیوں بھئی گزارا نہیں ہو رہا؟ وہ مسکرا۔

بابا جان کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہیے۔اس نے جیسے خود کو بہت کام والی ظاہر کیا۔

تو پھر ایڈمیشن لے لو پڑھائی کرلو۔انہوں نے اس کی دلیل کے جواب میں معقول دلیل دی۔

نہیں۔چودہ سال ایک سا کام کرکے میری طبیعت اکتا گئی ہے۔میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ انسان جب خود محنت کرکے پیسہ کماتا ہے تو اس کی فیلنگز کیا ہوتی ہیں۔پھر صبح صبح اٹھنا۔روز اچھے اچھے کپڑے اہتمام سے پہننا۔واہ کیا چارم ہے۔

وہ ان کو قائل کرنے کے ساتھ ساتھ تصور ہی تصور میں مزے بھی لے رہی تھی۔

بھئی کپڑے تو تم روزانہ ہی اچھے پہنتی ہو۔بابا جان گویا اس کے بچپنے پر ہنسے تھے۔

بیٹی، یہ دفتری کام ایک تھکا دینے والا عمل ہے۔تمہارے بس کی بات نہیں۔چند دنوں میں اکتا جاؤ گی انہوں نے اس کے مزاج کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہو سمجھانا اپنا فرض سمجھا۔

پھر کسی باس کو obey کرنا شاید تم برداشت نہ کرسکو۔انہوں نے نازوں کی پالی کو بڑی محبت سے دیکھا۔

اچھا ٹھیک ہے اگر نہیں کرسکی تو چھوڑ دوں گی مگر آپ اجازت تو دیں۔وہ بسوری۔

ٹھیک ہے۔اور سر چڑھا لو ابھی خود سری میں تھوڑی سی کمی باقی ہے۔

اماں جان نے ناگواری سے کہا۔وہ خاصی دیر سے بحث سن رہی تھیں۔بولیں اس لیے نہیں تھیں کہ شاید سردار مصطفیٰ خود ہی منع کردیں۔

مگر بیٹے کو نرم پڑتا دیکھ کر ان سے رہا نہ گیا۔

خود ہی چھوڑ دے گی اماں جان۔کر لینے دیں اسے یہ شوق بھی پورا۔وہ ماں کو جیسے مناتے ہو کہہ رہے تھے۔

کیا ہوگیا ہے تمہیں۔اور نہیں ہیں کام سیکھنے کے لیے۔آٹھ ماہ بعد تبریز واپس آجا گا۔بارات ہوجا کی اس کی۔کوئی گھر بسانے والے دھندے سیکھے۔ وہ ناراضگی سے گویا ہوئیں۔

) ہونہہ۔اب نہیں ہورہے ان کے گھر میں میرے بغیر کام۔اماں جان تو بس۔(

اماں جان پلیز۔

بابا جان کیساتھ چلی جایا کروں گی۔اور مودی بھائی کے ساتھ آجایا کروں گی۔اب وہ دادی کی طرف رخ موڑ چکی تھی۔

بھئی۔ ماننے والی تو تم ہو نہیں۔ میں تو تمہارے آگے کا سوچتی ہوں۔ ان کا موڈ ہنوز آف تھا۔

مگر بیٹی۔ جاب کیا ہے؟ سردار مصطفیٰ کو اچانک خیال آیا۔

اسٹینو۔ وہ جلدی سے بولی۔

لاحول۔ بھئی، یہ تم سے نہیں ہوگی۔ وہ نئے سرے بدک گئے۔

بابا جان۔ ففٹی سے اوپر ہے میری اسپیڈ، اور امپروو کرلوں گی۔ ایف ایس سی کے ایگزام کے بعد میں نے کورس کیا تھا ناں۔ اور گھر پر بھی تو پریکٹس کرتی رہی ہوں۔

گویا تمہاری پہلے ہی سے نیت رہی ہے۔ سردار مصطفیٰ نے اس کی بات کاٹ دی۔

میری عادت ہے بابا جان۔ فارغ وقت میں کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہوں۔ اس میں نیت کی کیا بات؟

بس یہی کیا ہے فارغ وقت میں، روٹی ابھی تک ڈھاکہ کا نقشہ ہوتی ہے۔ تمہیں کیا ہوگیا سمجھانے سے گئے اور الٹا۔ چند دن جاتے ہیں اپنے گھر کی ہو جا گی۔

اماں جان نے پھر ٹوکا۔

ابھی تو آٹھ ماہ ہیں کر لینے دیں اسے خود ہی باز سے آ جا گی۔ بابا جان نے سمجھایا۔

میں تو سوچتی ہوں، یہ شائستہ کے ساتھ نباہنے گی کیسے؟ وہ تو ایک ٹانکا غلط ہونے پر پورا کپڑا ادھیڑ ڈالتی ہے۔ لاکھ خالہ ہے مگر شادی کے بعد کوئی رشتہ نہیں رہتا۔ ساس۔ ساس ہوتی ہے۔ کوئی اس سے کاغذ ٹائپ نہیں کروا گا۔ روٹی مانگیں پکی ہوئی۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔

انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ سردار مصطفیٰ بیٹی کے سامنے ہمیشہ کی طرح ہتھیار ڈال دیں گے۔

دیکھو بیٹی۔ اس شرط کے ساتھ اجازت ہے کہ اماں جان کو خوش رکھنا ہوگا۔ انہوں نے تاکید کی۔

آپ فکر ہی نہ کریں بابا جان وہ اپنی جیت پر خوشی سے کھل اٹھی تھی۔ اس لیے اسے اب ہر بات غیر اہم محسوس ہو رہی تھی۔

اف مودی بھائی سارامزا کرکرا ہوگیا۔

وہ بیگ ایک طرف ڈال کر تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر ڈھے گئی۔

کس نے ڈالی ریت؟ وہ بھی اس کا بھائی تھا۔اسی کے انداز میں سوالیہ انداز میں جواب ملا تھا۔

باس۔بلیک ہے۔

مودی کی ہنسی چھوٹ گئی۔

گویا کل ریزائن کردو گی۔وہ ہمدردی سے پوچھ رہا تھا۔

نہیں خیر۔اب اتنی بھی جلد باز نہیں ہوں۔اینہ نے یہ تو نہیں بتایا تھا۔وہ کچھ سوچتے ہو بولی۔

اینہ بیوقوف نہیں ہے کہ اس قدر غیر اہم باتیں کرنے لگے۔یہ آپ اس قدر فارغ ہیں۔ جوان چکروں میں رہتی ہیں کہ فلاں گڈ لنگ ہے فلاں بیڈ۔بی بی حقیقت پسند بنو۔امریکی تمہیں دیکھیں تو اپنے عجائب گھر میں لے جا کر رکھ دیں کہ اس لڑکی کے پاس فراغت کا ذخیرہ

ہے۔دنیا کی بیکار ترین اور مطمئن کالڑکی۔وہ تو دن رات سکون کی دواؤں کی ایجاد میں سر کھپاتے رہتے ہیں۔

ان بیچاروں کی مصروفیت کا تو یہ عالم ہے کہ وقت کی کمی کے سبب کالوں کی مخالفت سے دستبردار ہوکر برابر بٹھانے لگے ہیں۔

ارے بس چار دن کی باتیں رہ گئی ہیں۔پتا چل جا گا۔آٹے دال کا بھاؤ۔اماں جان نے حسب معمول حزب اختلاف کی قائد کا رول ادا کیا۔

سچ مودی بھائی۔سارا ایٹ موسفیر ہی خراب ہوگیا اس بلیک باس کی وجہ سے۔ویسے برداشت ہو جا گا۔بہت کم بلاتا ہے اپنا ماتحتوں کو۔زیادہ انٹر کام سے لیتا ہے،

بھئی سیلری بہت پر کشش ہے ذرا دو ایک ماہ جھک مارلوں پھر سوچوں گی۔

مودی بھائی۔

بکو۔وہ کسی خاص قسم کے تیل سے سر کی مالش کر رہا تھا۔کسی نے خشکی توڑ نسخہ بتایا تھا۔

پہلی سیلری ملے گی نا تو آپ کے ساتھ فیشن آرکیڈ جاؤں گی۔ڈھیر۔ساری شاپنگ

کروں گی ایک پائی نہیں بچاؤں گی۔

بس کا کرایہ رکھ لینا۔ ہوسکتا ہے کسی دن بابا جان چھوڑنے اور میں لینے نہ پہنچوں۔

اس نے دور اندیشی کے مظاہرے کے طور پر اسے مشورہ دیا۔

اے ہاں۔ ترسی ہوئی ہے غریب، آج تک کچھ ملا ہی نہیں، تنخواہ ملے گی تو پھر دن پھریں گے۔

اماں جان جل کر بولیں۔

وہ ڈھٹائی سے کھی کھی کرتی باتھ روم میں گھس گئی تھی۔

لو بھلا باتیں ہیں اس کی۔۔۔؟ کوئی سنے تو کیا کہے۔ تمہیں اپنے کام سے غرض ہونی چاہیے۔ تمہیں کیا مطلب افسر کالا ہے یا گورا؟

عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتی ہے لڑکی۔

دیکھا تم نے۔؟ اے کیا گھول کر پلاؤں اسے۔ طوطا رٹاتی تو وہ بھی سیکھ جاتا۔ اماں جان پوتے سے پر تشویش انداز میں کہہ رہی تھیں۔

حالات من چاہے انداز سے ہم آہنگ تھے۔ آنے والے خوبصورت دنوں کے احساس نے مزاج کو اک الوہی سی خوشی سے سرشار کر رکھا تھا۔

اس کا گھرانہ ایک متوسط گھرانہ تھا۔

اماں جان کی اعلا انتظامی صلاحیت کے سبب اسے گھر میں کسی قسم کی ذمہ داری کا سامنا نہیں تھا، تھوڑا بہت ہاتھ بٹا دیتی تھی۔

دو جز وقتی گھریلو ملازم تھے۔ جو اس کے مزید آرام وسکون کا باعث تھے۔

مزاج کسی قسم کے بوجھ سے آشنا ہی نہیں ہوا تھا۔

طبیعت کی سوخوشی میں اس وقت مزید اضافہ ہو جاتا۔ جب ترکی سے ایک بڑے سائز کا لفافہ اپنے اندر انگنت خوشیاں اور رنگ لیے ہوآتا۔

یا پھر رات گیارہ بجے کے بعد ہفتے میں ایک فون۔

دبے پاؤں فون اٹھا کر اپنے بیڈ روم میں لے جاتی۔ دروازہ بند کر کے اس سیہمکلام

ہونے میں ایک الگ کشش تھی ،لطف تھا۔

سیاہ رات میں ڈھیروں جگنو اترتے محسوس ہوتے تھے۔

آج اس کا فون آنے کے سو فیصد امکانات تھے۔یہی وجہ تھی کہ ڈھیر سارے کام کے باوجود وہ آس ے والی خوشی کے سبب تروتاوہ نظر آ رہی تھی۔

مگر اس وقت اسے ازحد کوفت کا سامنا کرنا پڑا جب ساڑھے چھ بجے تک مودی کی راہ دیکھنا پڑی۔

ایک تو عرصہ ہوا بس میں نہیں بیٹھی تھی۔گھبراہٹ میں بس کا نمبر بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔اور ایک خوبصورت و پرکشش لڑکی کی جان عذاب میں آ جاتی ہے۔جب اسے مجبوراً تنہا کسی پبلک پلیس پر کھڑا ہونا پڑ جا۔

اتنی واہیات سی نگاہیں ،اسے رونا آ گیا تھا۔

معاف کیجیے۔مس۔۔۔

وہائٹ اکورڈ ایک دھچکے سے اس کے نزدیک رکی تھی۔

اف ایک ستم پھر بالائے ستم۔اس کی جان سلگ کر رہ گئی گاڑی سے بلیک باس جھانک رہا تھا۔

آپ کو کنوینس پرابلم ہے۔آیئے میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔تشریف لایئے۔

اس نے شام کے بڑھتے سا دیکھے۔اپنی استطاعت اور ہمت کا جائزہ لیا۔اور نہایت مجبوری کے عالم میں بیٹھ گئی۔

کار کے اندر کا ٹھنڈا سا ماحول بھی اس کی کوفت دور نہ کر سکا۔

یہ میرا روٹ نہیں ہے اتفاق ہے کہ میں آج آفس سے ہاسپٹل جا رہا ہوں۔وہ برے لیے دیے انداز میں بتا رہے تھے۔

ہاسپٹل۔اس کے منہ سے یونہی بلاارادہ نکل گیا۔

جی۔میری وائف ایڈمٹ ہیں۔

کیا ٹربل ہے انہیں سر؟اب آگے پوچھنا اخلاقی فرض بن گیا تھا۔

ٹی بی۔

ہائیں۔اسے جیسے شاک سا لگا۔اس نے گردن موڑ کر اپنے جنرل مینجر کا پہلی بار غور سے جائزہ لیا۔

یہ اتنی شاندار سی زندگی گزارنے والا۔اس کی سہولتوں سے پر زندگی میں شامل۔اس کی اپنی بیوی۔اس قدر فرسودہ بیماری میں مبتلا۔

مگر نہیں۔

کیا پتا اس شخص کا باطن بھی اس کے ظاہر جیسا ہو۔پھر کیا حیرت جو ساتھ رہنے والوں کو دق نہ ہو۔اس نے نخوت و نزاکت سے سوچا۔

بہت افسوس ہوا۔اس نے بمشکل اظہار ہمدردی کیا۔

سر یہ حسن اسکوائر سے دائیں طرف پلیز۔

گاڑی اسی سمت مڑ گئی تھی۔

دو منٹ کے مزید سفر کے بعد اس نے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔

تھینکس۔اے لاٹ سر۔

اس نے گاڑی سے اتر کر شکریہ ادا کیا۔

ان کے چہرے کے تاثرات میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔

اسے اپنے شکریہ ادا کرنے پر افسوس ہوا۔نہ بھی کرتی تو شاید کوئی فرق نہ پڑتا خواہ مخواہ ایک عدد شکریہ ضائع ہوا۔

وہ گھر کی سمت بڑھتے ہو سوچ رہی تھی۔

آج جمعہ تھا چھٹی تھی۔

مگر آج وہ اور دنوں سے زیادہ مصروف دکھائی دے رہی تھی۔

ان کے مینجر عثمان ترمذی کے ہاں سالانہ حلیم کی دعوت تھی سارا اسٹاف مدعو تھا۔

وہ بہت اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔

سفید نیٹ کی لانگ فراک سفید پائجامہ دوپٹہ زیب تن کیا تھا۔

سفید ہی نیٹ کے شوز اور بڑے بڑے موتیوں کے آویزے پہنے تھے۔ بےپناہ حسین اور منفرد دکھائی دے رہی تھی۔

ترمذی صاحب کے ہاں انسانوں کا اژدہام تھا گویا اعلا پیمانے پر دعوت تھی۔ وہ محفل میں پہنچ کر ادھر ادھر آشنا چہروں کو تلاش کرتی رہی تھی کہ اپنے بلیک باس پر نگاہ پڑی۔

وہ وی آئی پی نشست پر اپنے مخصوص سرد اور سنجیدہ انداز میں بیٹھے پائپ پی رہے تھے۔ السلام علیکم۔ نگاہ ملی تو سلام بھی کرنا پڑا۔ وعلیکم السلام آیئے تشریف رکھیے۔ انہوں نے اسے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

دور دور تک کوئی خالی نشست دکھائی نہ دے رہی تھی، وہ احتیاط سے بیٹھ گئی۔

ڈھیر ساری نگاہیں اس پر تھیں۔

اس کی فطری خود اعتمادی اور نخوت عود کر آئی۔

اس کی نشست میں شاہانہ پن خود بخود پیدا ہو گیا۔

کٹار نین جس سمت اٹھ جاتے اسے اپنے نصیب پر پیار آنے لگتا

معاوہ خیال کی دنیا سے باہر آئی۔

اسے احساس ہوا اس وقت وہ کہاں اور کس کے قریب بیٹھی ہے۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور گردن موڑ کر سر کی طرف دیکھا۔

آپ کی وائف کیسی ہیں سر؟

قدرے بہتر ہیں۔ انہوں نے ایک اچٹتی اور بےنیاز سی نظر اس پر ڈالی۔

کتنا عرصہ ہو ہے انہیں اس بیماری میں مبتلا ہو؟ وہ چپ بیٹھے بیٹھے جیسے تنگ آ گئی تھی۔

جب میری شادی ہوئی تو وہ اس بیماری میں مبتلا تھیں۔

ہائیں۔ وہ سخت حیران ہوئی۔

آپ کو پتا تھا۔۔۔؟

جی۔۔ مختصر جواب ملا۔

ہیں۔ اس کی حیرت میں سو گنا اضافہ ہو گیا۔

)اف۔ بیچارے سر کو شاید گہری رنگت کی وجہ سے کوئی رشتہ نہیں دے رہا ہو گا(اسے ترس آ گیا۔

اتنا شاندار عہدہ، معاشرتی مقام بھی سر کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکا۔ چچ۔ چچ۔ اسے حد درجہ تاسف ہوا۔

بی بی۔ میں نے ان سے شادی مجبوراً نہیں بلکہ پوری آمادگی سے کی تھی۔

وہ شاید اس کا چہرہ پڑھ رہیت ھے۔

وہ گر بڑا گئی۔

سر یہ تو بہت ہمت کی بات ہے کہ۔

ایسی کوئی بات نہیں مس مصطفیٰ۔ جب وہ سترہ سال کی تھیں تو ان سے کمٹ منٹ ہو گیا تھا میرا وہ بہت نائس ہیں۔

لیکن سر آپ کو جب یہ پتا چلا ہو گا کہ۔

وہ بیمار ہیں۔ وہ مسکرا دیے۔ چاند نے انہیں پہلی بار مسکراتے دیکھا تھا۔

یہ بات شاید آپ کی سمجھ میں نہیں آ گی۔ انہوں نے گہرا کش لے کر ڈھیر سارا دھواں چذ وڑا۔

سر میں ان کی عیادت کرنا چاہتی ہوں اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔ اسے سر کی مسز سے ملنے کا از حد اشتیاق ہوا۔

کیوں نہیں آپ جب چاہیں مل سکتی ہیں، ایڈریس نوٹ کر لیجیے۔

اس نے اپنے پرس سے اپنی پاکٹ ڈائری نکالی۔ ہاسپٹل کا نام اور وارڈ نمبر وغیرہ نوٹ کیا۔

ٹھیک ہے سر، ویسے آپ ان سے میرا تعارف ضرور کرا دیجیے گا تا کہ ملاقات میں اجنبیت کا تاثر نہ ہو۔

ڈزن میٹر۔ بی بی۔۔۔

پھر اسے اپنی کرسچن کولیگ جولی نظر آ گئی تو وہ سر کے پاس سے اٹھ گئی۔

شام کے چار بجے تھے۔ جب اس نے اسپیشل وارڈ میں قدم رکھا۔

بیڈ پر نیم دراز مریضہ نے آف وہائٹ کرتے شلوار میں ملبوس بیحد پیاری سی لڑکی کو دبے پاؤں اندر آتے دیکھا تو دوستانہ مسکراہٹ لبوں پر در آئی۔

السلام علیکم۔ وہ احتیاط سے مسکرائی۔

وعلیکم السلام۔

مجھے۔

مس چاند مصطفیٰ کہتے ہیں۔ انہوں نے اس کے لبوں سے فقرہ چھین لیا۔

اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

جمشید آپ کا غائبانہ تعارف کرا چکےہیں۔

کیا بات۔؟ بری دیر کی مہرباں آتے آتے؟ ان کی بےتکلفی سے ان کے مزاج کی خوبصورتی کا پتہ مل رہا تھا۔

روزانہ آفس سے آف ہوتے ہوتے خاصی دیر ہو جاتی ہے۔ پھر بھائی وغیرہ بھی کہیں نہ کہیں گئے ہوتے ہیں۔ کوئی ساتھ آنے والا ہی نہیں ملتا تھا۔

آج آفس نہیں گئی تھی، موڈ نہیں ہوا تھا۔ سوچا موقع اچھا ہے، کیوں نہ آج آپ سے شرف ملاقات حاصل کیا جا۔

ارے۔ وہ ہلکے سے ہنس دیں۔

ہمارے تو سارے شرف اندھیروں میں ڈوب رہے ہیں۔

اللہ نہ کرے، آپ اتنی ہوپ لیس نہ ہوں۔ انشاءاللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ سر آپ سے بےپناہ محبت کرتے ہیں کیا آپ کو اندازہ نہیں؟ وہ سادگی سے پوچھ رہی تھی۔

اور ساتھ بغور ان کا جائزہ لے رہی تھی۔

کھنڈر بتا رہے تھے کہ عمارت بیحد حسین تھی دراز قامت، سفید رنگ۔ ستواں ناک، گھنی پلکیں۔

اف۔ جب یہ بیمار نہیں ہوں گی تو کیا ہوں گی۔ اس نے اندازہ لگایا۔

آپ کا نام؟ اس نے پوچھا۔

علقمہ، گویا آپ کی ہم نام ہوں۔ وہ مسکرائیں۔

اچھا۔ دراصل میری اردو بس گزارے لائق ہے۔ وہ جھینپ کر بولی۔

کوئی بات نہیں۔

ایک بات پوچھوں، آپ مائنڈ تو نہیں کریں گی۔

ارے نہیں، جو دل چاہے پوچھو۔

آپ کی اور سر کی لو میرج ہے؟ اس نے جھجکتے ہو پوچھا۔

ہوں۔ اثبات میں جواب ملا۔

میں تو کسی طرح بھی ان کے قابل نہیں تھی، سچ پوچھو۔ جمشید بہت عظیم انسان ہیں۔ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

میں نے اپنی سوتیلی والدہ کے ساتھ بغیر باپ کے تیرہ برس گزارے ہیں۔

اس عورت کے ساتھ گزرنے والے ایک ایک لمحے کا اندازہ صرف خدا کو ہی ہو سکتا ہے۔

جمشید ہمارے پڑوسی تھے، اس حوالے سے ہمارا ملنا جلنا ہوا تھا۔ ان کا وہاں اپنا مکان تھا۔ ہم کرایہ پر تھے۔

وہ سانس لینے کو رکیں۔

چاند نہایت انہماک سے ان کی داستان سن رہی تھی۔

اسے تو یہ تجسس یہاں کھینچ کر لایا تھا کہ وہ دیکھنا چاہتی تھی، ایسی کیا خاص بات ہے اس عورت میں جو بیمار ہونے کے باوجود قبول کی گئی۔

سچ پوچھیے میں تو اس قدر دکھ کی فصل کاٹ چکی تھی کہ مجھے آنے والی کسی خوشی کا یقین ہی نہیں تھا۔ نہ مجھے خوشی کی آس تھی اور نہ میں خوشی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھتی تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ جمشید نے مجھے کیسے دیکھا۔ کہاں دیکھا۔ ان دنوں یہ صرف اسٹوڈنٹ تھے۔ اس کے باوجود ان کی والدہ نے آ کر میرے لیے بات کی۔

ان کا سوشل بیک گراؤنڈ خاصا مضبوط ہے، شاید وہ اسی اعتماد کے سہارے ہمارے ہاں

آئی تھیں۔مگر سوتیلی والدہ نے زمین آسمان ایک کر دیے۔

اس درجہ مجھ پر بہتان طرازی کی کہ مجھے واقعی یقین ہونے لگا کہ میں غلط ہوں۔انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

اتنے خوشحال، وضع دار خاندان میں میری شادی۔میرے سکھ ان کی برداشت سے باہر تھے۔مجھے خبر بھی نہ ہوئی اور انہوں نے چپکے چپکے مکان بدلنے کی تیاریاں بھی کر لیں۔پھر ہم وہاں سے بہت دور چلے آ۔

آتے ہو آپ سر سے ملی تھیں؟ چاند نے ان کی بات کاٹ کر گہرے تجسس کا

مظاہرہ کیا۔

ارے۔میں ان کا سایہ تک نہیں دیکھ سکتی تھی۔وہ نڈھال سے انداز میں ہنسیں۔

جمشید کے پرپوزل نے تو اذیت کا ایک نیا در کھول دیا تھا وہ واقعات تمہیں سنانا۔گویا اپنے ہی زخم ہرے کرنا ہے بس یہ سمجھ کہ زندگی باقی تھی یا سخت جان تھی۔

میں تو سخت بزدل اور کم ہمت رہی ہوں۔بس ہمارے ملنے میں سراسر محنت اور سچائی

جمشید کی ہے۔

پھر آپ سر سے کیسے ملیں؟ چاند کی محویت ٹوٹ کر نہیں دے رہی تھی۔

پھر جب ہم ملے تو درمیان میں پندرہ برس گزر چکے تھے۔انہوں نے عجیب سے انداز سے عرصہ بتایا۔

پندرہ سال۔چاند نے اپنی پیشانی تھام کر شدید حیرت کا بیساختہ اظہار کیا۔

علقمہ جمشید مسکرادیں۔

ایگزیکٹ۔ففٹین ایرز۔

آپ کی اس وقت عمر کیا ہے؟ معاف کیجیے گا۔اس نے تھوڑا جھجک کر پوچھا۔جیسے اپنے ہی سوال کے قابل اعتراض ہونے کا اعتراف کیا۔

چونتیس یا پینتیس سال۔۔جواب ملا۔

اپ کی شادی کو کتنے سال ہوہیں۔چاند نے حیرت سے پوچھا تھا۔

پونے دو سال۔

صرف چاند کی حیرت میں کمی نہیں ہو رہی تھی۔

صرف۔علقمہ جمشید مسکرائیں۔

جمشید مجھ سے سات آٹھ برس بڑے ہیں۔

اف۔چاند نے پھر آنکھیں پھاڑیں۔

انڈرسٹینڈنگ ہو تو یہ فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔اس سے زیادہ بھی ہو جاتو بھی۔

انہوں نیبہت اپنائیت سے جیسے اسے سمجھایا۔

آپ یہ تو بتائیے کہ سر نے آپ کو تلاش کیسے کر لیا؟ جب کہ پندرہ برس کا عرصہ معمولی نہیں۔

میں بھی ان سے پوچھتی ہوں نہیں بتاتے مسکرا دیتے ہیں بس۔ پندرہ سال انہوں نے صرف میرے خیال کے ساتھ گزار دیے۔اس قدر تصوراتی سی بات، خود بھی سوچتی ہوں تو خود ہی کو یقین نہیں آتا۔

جب یہ ملے تو مجھے یہ موذی بیماری لگ چکی تھی۔سوتیلی ماں کا عارضہ ختم ہوا تو یہ نیا عارضہ لگ گیا۔ میں نے جمشید کو صاف انکار کر دیا کہ میں ان کے قابل نہیں ہوں۔اب آپ کے پاس کس شے کی کمی ہے؟

آپ کو ایک شاندار اور صحت مند بیوی مل سکتی ہے۔پھر آپ خواہ مخواہ کیون ایک عذاب مول لے رہے ہیں۔

پھر۔۔؟اس کے استعجاب بدستور تھے۔

پھر کیا ناراض ہو گئے۔کہنے لگے کہ میں ان کے جذبے کی توہین کر رہی ہوں۔

میں ہار گئی ہر طرح سے۔ایک شام بڑی سادگی سے ہمارا نکاح ہو گیا۔ان کے سب گھر والے شریک ہو میری بیماری کا تذکرہ انہوں نے اپنے گھر والوں سے نہیں کیا تھا۔اب میں ہوں اسپتال ہے اور ان کی محبت ہے۔انہوں نے تھک کر جیسے آنکھیں موند لیں۔

آپ کو اس عرصے میں کبھی یہ خیال آیا تھا کہ آپ سر سے ملیں گی؟

علقمہ جمشید کو اس کی بچوں جیسی حیرت آمیز سنجیدگی پر پیار آ گیا۔

انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

زندگی میں کبھی خوشی محسوس ہی نہیں کی تھی۔ اس قسم کی کسی آس کا میری زندگی میں گزر نہیں تھا، میں تو آج تک بھی بےیقینی کی کیفیت میں ہوں ان سے پوچھتی ہوں کیا ملا آپ کو مجھ سے؟

بلاوجہ کی محنت اور دردسری۔

تم اتنی حیران کیوں ہو؟ تمہیں تو جو دیکھتا ہوگا پیار کرتا ہوگا۔ تمہیں تو محبتوں کے خزانے حاصل ہوں گے پھر اس قدر حیرانی کیوں؟ انہوں نے چاند کو نظر بھر کر دیکھا۔

آں۔ ہاں۔ وہ چونک پڑی۔ پھر جھینپ کر مسکرا دی۔

یہ بات نہیں میں کچھ اور سوچ رہی تھی، اچھا میں چلتی ہوں پھر آؤں گی۔

ضرور آنا، مجھے انتظار رہے گا۔

اور سنو۔

جی۔ وہ اپنا پرس اٹھاتے اٹھتے رک گئی۔

جمشید کو بالکل احساس نہ ہونے دینا کہ میں تمہیں سب کچھ بتا چکی ہوں۔ ممکن ہے، وہ پسند نہ کریں میں تو تمہارے سامنے بیاختیار سی ہوگئی۔ نہ جانے کیوں تم مجھے اپنی اپنی سی لگ رہی ہو۔ تم نے میرے بارےمیں تو سب کچھ پوچھ لیا۔

اپنے بارے میں تو کچھ بتاؤ کتنا پڑھا ہے، کہاں رہتی ہو۔ کتنے بہن بھائی ہو۔؟؟؟

اف ایک دم اتنے سوال، میں نے تو آپ سے ایک ایک کیا تھا۔ وہ ہنس دی۔

گریجویٹ ہوں۔ گلشن میں رہتی ہوں۔ تین بہن بھئی ہین۔ ایک میں دو بھائی۔ اس نے اسی طرح کھڑے کھڑے بتایا۔

انگیج ہو؟

آپ کا کیا اندازہ ہے؟ وہ تھوڑا سا شرما کر مسکرا دی۔

انگیج تو ہوگی۔ کون چھوڑ سکتا ہے تمہیں زیادہ دن۔ وہ مسکرائیں۔

کیا کرتے ہیں تمہارے منگیتر؟

جی۔۔۔ اپنا بزنس ہے ان کا۔

نام کیا ہے؟

تبریز۔اسے نام لے کر جیسے خود ہی سرور آ گیا۔

بہت خوب،ٹھیک ہے پھر آنا۔ مجھے انتظار رہے گا۔

جی ضرور۔وہ پلٹ گئی۔مگر ایک دم رک گئی سامنے سر جمشید کھڑے تھے۔

السلام علیکم سر۔۔۔وہ گڑبڑا سی گئی۔

وعلیکم السلام۔ٹھیک ہے ہیں آپ؟ بیحد رسمی سا انداز تھا۔ساری توجہ اپنی مسز کی طرف تھی۔

یس سر۔

آپ کی چاند مصطفیٰ ہمیں بہت بھائی ہیں جمشید۔اسے عقب سے علقمہ جمشید کی آواز سنائی دی۔

وہ مسکرا کر باہر آ گئی۔

گھر آتے آتے اس نے کیا کیا سوچ ڈالا تھا۔

ارے۔یہ بلیک باس۔ایک دم اسٹیڈ فاشٹ نکلا ہاؤ اسٹرینج۔

شاید اپنے کامپلیکشن کے کامپلیکس میں اپنی ذات کے حصار سے باہر ہی نہ نکل سکا۔

اسے یقین ہی نہیں آے دے رہا تھا کہ لوگ اس درجہ بیلوث اور بیغرض بھی ہو سکتے ہیں۔

گھر میں قدم رکھتے ہی اس کی طبیعت مکدر ہو گئی۔

سامنے کمال بیٹھا تھا اور اماں جان واری صدقے جا رہی تھیں۔

آپا مٹھائی کھائیں۔ذکی نے آگے رکھی پلیٹ کی سمت اشارہ کیا۔

کس خوشی میں؟ وہ چڑ کر بولی۔

اب ہم بھی سورس والوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ پولیس والے ہمارے رشتیدار ہو گئے

ہیں۔کمال بھائی ایا پیپی ہو چکے ہیں اور آپ بیخبر ہیں۔

تو کیا بھنگڑا ڈالوں مارے خوشی کے؟ وہ پرس ایک طرف اچھال کر بیرخی سے بولی۔

ارے یہ نرگسیت کا شکار لوگ، انہیں اپنے آپ سے فرصت نہیں انہیں کیا پت۔

کہ ہمرے سر پر سینگ نکل آ ہیں۔اس نے جل کر کمال کی بات کاٹ کر ٹکڑا اجڑا۔

بات کرنے کی تو ذرا تمیز نہیں۔اماں جان کو کمال سے زیادہ برا لگا، وہ اٹھ کر چلی گئیں۔

کب آ رہے ہیں اپ کے وزر؟ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

آ ہی جائیں گے۔

ترک عورتون کا کامپلیکشن بھی فیئر ہوتا ہے اچھا خاصا۔

مطلب؟ وہ بھنائی۔

مطلب یہ کہ سوا سفید رنگت کے آپ میں کوئی اور خوبی تو ہے نہیں، یہی خوبی کہیں اور پا کر کہیں آپ کے وہ۔

خوبی دیکھنے کے لیے آنکھیں ہونی چاہئیں۔آپ تو یوں بھی اندھیروں میں رہتے ہیں۔

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

خوش امیدی احمقوں کی حت ہوتی ہے۔ٹھیک ہے۔آپ وہیں رہیے۔ہے ہی آپ کے لیے۔

دیکھ رہی ہیں اماں جان پھر آپ کہتی ہیں کہ۔

آہستہ محترمہ۔اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔جنت میں رہنا تو بہت اچھی بات ہے۔

وہ کی رنگ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

اچھا اماں جان چلتا ہوں۔

ارے کہاں چلا کھانا کھا کر جانا۔وہ نہ جانے کس کونے سے نکل آئیں۔

کھانے میں تو ابھی خاصی دیر ہے۔پھر سہی۔

اچھا یار، خدا حافظ اس نے ذکی کی پشت پر ہاتھ مارا اور اس کی سمت دیکھے بغیر باہر نکل

گیا۔

وہ تمہارے پھوپھا کا دوسری مرتبہ فون آ چکا ہے۔ ہفتہ باقی رہ گیا ہے شادی میں نمو بلا رہی ہے، چھٹیاں لے کر چلی جاؤ۔اماں جان نے اسے یاد دلایا۔

ہاں۔میں کل بات کروں گی آفس میں۔وہ جیسے بادل نخواستہ اٹھتے ہو بولی۔

خواہ مخواہ کی مصیبت مول لی ہے اچھی بھلی آزادی تو تھی جب چاہے انسان کہیں چلا جا موئی نوکری، شکل دیکھو کیا ذرا سی نکل آئی ہے کبھی کیا تھا ذمہ داری سے کوئی کام۔

اکتوبر میں آ گا تبریز۔اگست میں استعفی دے دینا۔سن لیا؟

سن لیا۔وہ جیسے زچ ہو کر بولی تھی۔

اس کی پھوپھی نمبر دو اندرون سندھ میں رہتی تھیں۔انہی کی بیٹی کی شادی تھی۔

وہ چار دن پہلے پہنچی تھی۔

سارے ملک کے بسنے والے رشتے دار اکٹھے ہو رہے تھے۔خوب گہما گہمی تھی۔اسے تو بیحد تفریح میسر آ رہی تھی۔

شاپنگ کے سلسلے میں کئی چکر تو حیدرآباد کے ہی لگ چکے تھے۔جیپ میں اتنا لمبا سا سفر طے کر کے آنے جانے میں اسے علیحدہ ایڈونچر میسر آیا تھا۔

بارات کراچی سے علی الصبح پہنچ رہی تھی۔

وہ بھی منہ اندھیرے بیدار ہو چکی تھی۔

پھوپھی کے گھر کے چاروں طرف باغ تھا۔صرف پورچ کا حصہ پختہ تھا۔وہ ٹہلتی ہوئی پورچ سے باہر آ گئی۔اور گھاس پر ننگے پاؤں چل رہی تھی، گرمیوں کی صبح میں شبنم کی ٹھنڈک کا احساس۔

وہ سرمستی کی کیفیت میں آگے چلتی چلی گئی۔

نہ جانے کن مدھر خیالوں میں گم تھی۔

کہ اچانک کسی کے فولادی ہاتھ نے اس کے منہ پر قبضہ جما لیا۔اس سے قبل کہ وہ کچھ

سمجھتی ہوشیار ہوتی۔ایک عجیب سی باس والا کپڑا اس نے ناک پر محسوس کیا۔

اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

نہ جانے کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا تھا۔

چہار سو انتہائی ناگوار سی بو اور ہولناک اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

اتنا گہرا اندھیرا تھا کہ اس نے وحشت زدہ ہو کر ہولناک سی چیخ ماری تھی۔اور اپنی ہی چیخ کی بازگشت سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔

یہ کون ڈسٹرب کر رہا ہے ہمیں؟ ایک بھاری سی آواز اس نے سنی،ساتھ ہی کوئی تیل کا لیمپ لیے سامنے آ گیا۔

مارے دہشت کے اس سے تو نظریں نہ اٹھائی گئیں۔

بی بی آپ کو کیا تکلیف ہے،بتایئے ہمارے لائق کوئی خدمت؟

اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔خوف سے گھگھی بندھی ہوئی تھی،ایک حرف منہ سے نکالنے کی ہمت نہیں تھی۔

ہاں بی بی۔تو کیا تکلیف ہے آپ کو؟ وہ آگے بڑھا۔

وہ ایک دم بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔نہیں۔نہیں پلیز۔

ابھی تو ہم نے آپ کو کچھ دیا ہی نہیں۔آپ نے انکار بھی کر دیا تعجب ہے۔

اس نے ڈرتے ڈرتے سامنے نگاہ کی اونچا پورا مرد۔بڑی خباثت سے مسکرا رہا تھا۔

بالوں سے بھرے ہو بازو لیمپ تھامنے کی وجہ سے اس کے سامنے تھے۔جن کی مضبوطی سے اس کی وحشت اور بڑھ رہی تھی۔

بھئی ہمارے ارادے تو خاصے نیک تھے مگر لگتا ہے تمہارا حسن ہی تمہاری مصیبت بن رہا ہے اب دیکھو نا تم نظر انداز کرنے کے قابل تو نہیں ہو ناں۔

اور اللہ کی زمین پر کچھ حق ہمارا بھی ہے۔

پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ۔

ٹرپل زیرو۔معاً اس نے نئی آواز سنی۔

لیمپ والا ایک دم ٹھٹک گیا۔

ابھی۔؟ وہ اندھیرے میں کھڑے شخص سے پوچھ رہا تھا۔ ٹرپل زیرو کے کوڈ سے ہی وہ میسج سمجھ گیا تھا۔

ابھی۔ جواب ملا۔

گاڑی ہے باہر؟

ایک دم تیار۔ آواز آئی۔

چلیے میڈم۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔

مجھے ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں۔ چل رہی ہوں۔ وہ غرائی۔ سارا خوف ایک دم ہوا ہو گیا تھا۔

جیسے ملکہ عالیہ پسند فرمائیں۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا۔

وہ ٹھوکریں کھاتی ہوئی اسی دیو کی رہنمائی میں آگے بڑھنے لگی۔

یہ کیا حماقت ہے اسی طرح لے آ ؟ اس نے ایک ناراض سی آواز سنی۔

رات کا وقت ہے۔ اس نے لیمپ والے کی آواز سنی۔

اسی دم دو لڑکے سامنے آ گئے۔

رات دن سے کیا فرق پڑتا ہے مرواؤگ یار۔ وہی جھنجھلائی ہوئی آواز۔

ایک نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ بیدردی سے پیچھے کر کے باندھنا شروع کر دیے۔

دوسرے نے سیاہ پٹی اس کی آنکھوں پر کس دی۔

وہ پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔

دیکھو شہزادی اگر شور مچانے کی کوشش کی تو منہ میں کپڑا ٹھنس دیں گے، سمجھیں۔ کوئی اس کے کان میں غرایا۔

پھر کسی نے پلکر کر اسے گاڑی کے اندر بٹھا دیا۔ گاڑی کے اندر پھیلی ہوئی ٹھنڈک نے اسے سمجھا دیا کہ گاڑی کے شیشے چڑھے ہو ہیں گویا اگر وہ شور بھی مچا کی تو بیسود۔

اس نے بے بسی سے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

مگر اگلے ہی لمحے وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔اس کے دائیں بائیں دو وجود ڈٹ چکے تھے۔

کون ہو تم لوگ؟ وہ بھل بھل رو پڑی۔

میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

ہم آپ کے چاہنے والے ہیں آپ کو یاد نہیں؟ سو سال پہلے مجھے تم سے پیار تھا آج بھی ہے کل بھی رہے گا۔

دائیں طرف والے نے بڑے بھونڈے انداز میں گانا شروع کیا۔

چھی۔چھی۔اتنی گھٹیا گفتگو سننے سے پہلے اس کے کان کیوں نہ پھٹ گئے۔گاڑی چل پڑی تھی۔

مجھے تو گردش حالات پہ رونا آیا

رونے والے تو بتا تجھے کس بات پہ رونا آیا

بائیں طرف سے کوئی اس کے کان میں گنگنایا۔

اس کی سسکیاں مزید تیز ہو گئیں۔بلکہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

چمپانزی یار، کوئی اچھا سا لطیفہ سناؤ۔تا کہ رونے والے ہنس پڑیں۔دائیں طرف سے آواز آئی۔

مشکل ہے یار، آنسوؤں کی گاڑی سیکنڈ گیئر میں ہے بریک لگنا مشکل ہے۔بائیں طرف والے نے مجبوری ظاہر کی۔

اچھا تو کوئی لوری سناؤ تا کہ بچی سو جا۔

بچی ہا۔ہا۔ہا۔یار جب یہ بچی ایسی ہے۔تو پکی کیسی ہو گی؟

اف۔اس کا دماغ سنسنانے لگا۔اس کے اعصاب جواب دے گئے۔وہ دائیں طرف جھول گئی تھی۔

گاڑی بدستور دوڑ رہی تھی۔اسے خود بخود ہوش آ گیا تھا۔

دائیں طرف والے نے اسے اپنے بازو کے حصار میں لے کر شانے سے ٹکا رکھا تھا۔

حواس بیدار ہوتے ہی اس نے ناگواری سے اس کا بازو اپنے سے ہٹایا۔

ناراض کیوں ہوتی ہو لو خود ہٹا لیتے ہیں۔حکم تو کرو۔عجیب روح سلگانے والا لہجہ تھا۔

چار گھنٹے آپ نے انہیں بازوؤں میں سو کر گزارے ہیں۔ بڑی عزت دی جی آپ نے ہم غریبوں کو۔

یاالٰہی ۔اسے پھر چکر آ گیا۔

کاش اس کار کا ایکسیڈنٹ ہو جا۔اس کے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔اس نے دل کی گہرائی سے دعا کی۔

اپنی عزت بچانے کے لیے ایک عظیم عزم وہ اختیار کر چکی تھی۔ ہر قیمت پر جان دے دینے کا عزم۔

موت سے دوستی کے بعد ہر خوف ختم ہو جاتا ہے۔

وہ اگلے مرحلے کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔

اب وہ یہ نہیں سوچ رہی تھی کہ اسے کیوں اغوا کیا گیا ہے اب وہ صرف یہ سوچ رہی تھی کہ

اس نے کس طرح زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے۔

کیونکہ یہ اندازہ تو وہ لگا چکی تھی کہ ان کے چنگل سے چھٹکارا پانا آسان نہیں۔ بلکہ ناممکن ہے۔نہ ہی ان لوگوں نے اس پر اپنے عزائم آشکار کیے تھے۔

اس کے ہر سوال کا جواب عجیب سوقیانہ سا ملا تھا،لہذا اب وہ لب نہ کھولنے کا تہیہ کر چکی تھی کہ جو ہو گا دیکھا جا گا۔اور پھر جب مرنا ہی ہے تو۔

مگر یہ مجھے لے کر جا کہاں رہے ہیں۔ایک سوال بدستور اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے مزید سفر کے بعد کار دھچکے سے رک گئی۔

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا۔مگر تمام حسیات انتہائی شارپ تھیں۔

گیٹ کھلنے کی آواز آئی پھر کار آہستگی سے غالبا پورچ میں داخل ہوئی اور رک گئی۔

گیٹ لاک کر دو۔اس نے ایک آواز سنی۔

Released on 2008

گاڑی کے دروازے کھلے پھر کسی نے اس کا بازو تھاما۔

ست بسم اللہ جی آیا نوں۔چھج پتاشے ونڈاں۔اج قیدی کرلیا ماہی نوں۔

دائیں طرف والے نے لہک کر گانا شروع کر دیا۔

شٹ اپ وہ گلا پھاڑ کر چیخ پڑی تھی۔

اسٹاپ؟ ہاں جی اسٹاپ آ گیا ہے۔ہاہا۔ہا۔بیہنگم قہقہے ابھرے۔

بی بی جان، آہستہ بولو۔حلق پھٹ جا گا۔نقص پڑ جا گا۔یہ تو آپ جانتی ہوں گی کہ ایک بھی نقص پڑ جا تو قربانی جائز نہیں ہوتی۔ہاہا۔ہا۔

وہ اپنی جگت بازی سے خود ہی مزے لے رہے تھے۔

دونوں طرف سے اس کے بازو تھام لیے گئے تھے۔

وہ ننگے پاؤں تھی ٹھنڈے فرش پر چلتے ہوا سے احساس ہو رہا تھا کہ فرش ماربل کا ہے۔

پھر ایک طرف مڑنے کا احساس ہوا۔میڈم زینے ہیں احتیاط سے۔

یار اب تو پرائیویسی ہوگئی ہے پٹی ہٹا دو مگر ہاتھ نہ کھولنا۔لوگ ستم گری سے باز نہیں آتے۔بائیں طرف والے کی آواز آئی پھر وہ ٹھہر گئے۔

ایک نے اس کی آنکھوں سے سیاہ پٹی ہٹا دی۔

پٹی کھلنے کے باوجود اس کی آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا نہیں چھٹا۔وہ کھڑی وحشت زدہ انداز میں پلکیں جھپکاتی رہی ہرے، پیلے، لال، نیلے، دائرے آنکھوں کے سامنے ناچ رہے

تھے۔اسے یوں محسوس ہوا گویا اس کی بینائی زائل ہو چکی ہو۔

وہ گھبرا کر زور زور سے آنکھیں ملنے لگی۔

ٹک ٹک کی آواز کیساتھ سوئچ آن ہو تیز روشنیاں چہار سو پھیل گئیں۔اور وہ بمشکل دیکھنے کے قابل ہوئی۔

سب سے پہلے اس نے دائیں طرف والے بیہودہ انسان کو دیکھنا چاہا۔

وہ تقریباً اس سے تین بالشت اونچا تھا۔

سرخ سفید۔خوف زدہ کرنے والی گلابی آوارہ آنکھیں۔اس نے فورا نظروں کا رخ موڑ لیا اور بائیں طرف دیکھا۔وہ بھی تقریبا اپنے ساتھی کا ہم قد تھا۔سفید رنگت اور سرخ ستواں ناک والا،بھاری پپوٹوں والی بھوری آنکھیں۔اور بیتر تیب سے بھورے بال۔

چمپانزی میڈم،چوز)پسند(کررہی ہیں۔بائیں والے نے آنکھ ماری۔

اور چاند کا جی چاہا،ہاتھوں کی رسی توڑ ڈالے اور پوری قوت سے اس کے منہ پر طمانچہ کھینچ مارے۔

آیئے اس نے مسکراتے ہوزینے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ناچار آگے بڑھی۔

میڈم یہ آپ کی آرام گاہ ہے۔اوہ۔سوری میرا مطلب ہے خواب گاہ ہے۔چمپانزی نے خجل ہونے کی ایکٹنگ کی۔

بیانتہا ٹھنڈا کمرا تھا ایک تو انڈر گراؤنڈ تھا۔دوسرے شاید اےسی بھی چل رہا تھا۔طویل و عریض ہال نما کمرا تھا۔

دائیں طرف پوری دیوار لکڑی کی الماریوں سے پر تھی درمیان میں جہازی سائز اونچے کٹہرے والا بیڈ تھا،بائیں جانب پرپل مخملیں صوفہ سیٹ تھا۔اور فرش پر ایک چھوٹا ایرانی قالین تھا سجاوٹ کا حصہ تھا۔تشریف رکھیے۔

بھورے بالوں والے نے بیڈ کی سمت اشارہ کیا،اندر اس طرح دل پھڑکا جیسے پنجرے میں پرندہ،وہ اس سے ذرا فاصلے پر کھڑے ہوتھے۔

وہ آگے بڑھی۔اور ون سیٹ صوفہ پر بیٹھ گئی۔اس طرح اس نے جیسے خود کو محفوظ کیا تھا،اس کے بازوؤں میں شدید درد ہو رہا تھا۔

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔مریرے ہاتھ کھول دو۔فار گاڈ سیک۔یا پھر کٹ ڈالو،مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہورہی۔حسین چہرے پر بیبسی اور تکلیف کے تاثر نے نئے رنگ بکھیر دیے تھے۔

بھورے بالوں والے نے چمپانزی کی سمت دیکھا پھر سگنل کلیئر پا کر آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ آزاد کر دیے۔کئی گھنٹے بندھے رہنے کی وجہ سے کلائیوں پر سرخ گہرے نشان پڑ گئے تھے۔جن میں شدید جلن ہورہی تھی اگرچہ وہ اب تک خود کو بیخوف ظاہر کرنے کی کوشش میں خاصی کامیاب رہی تھی مگر اب ایک ٹھکانے پر آکر اس پر نئے سرے سے خوف کی چادر تن چکی

تھی۔

وہ ہر آن خود پر موت کو مسلط دیکھ رہی تھی۔

جب تک وہ دونوں تھے وہ پھر بھی خز د کو مضبوط محسوس کر رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی بھورے بالوں والا باہر گیا، اس کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ مارے دہشت کے اس سے نظریں نہ اٹھائی گئیں۔

مم۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ اس کی آواز کی لرزش صاف محسوس ہو رہی تھی۔

چمپانزی اٹھا اور کونے میں رکھے ون ڈو فریج سے بوتل نکال لایا، اور ایک گلاس میں پانی انڈیل کر اس کے قریب چلا آیا۔

نوش فرمایئے۔ اس کے لہجے کی آوارگی پر اس کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا۔

تم لوگ مجھے یہاں کیوں لا ہو یہ تو بتا دو۔ اس نے فوری طور پر آنسوؤں کو ڈھال بنایا۔

ڈرو نہیں شہزادی، ہم تمہیں بڑے نازوں سے رکھیں گے۔ کتنے دن؟ یہ تمہارے باپ کی عقل پر ڈپینڈ کرتا ہے۔

میرے باپ کی؟ اس نے حیرت سے اس کی سمت دیکھا۔

جی آپ کے والد محترم۔ جناب قبلہ خان علی شیر خان صاحب۔

اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔

علی شیر خان میرے والد نہیں ہیں پھوپھا جان ہیں میرے۔ اس نے پہلی فرصت میں تصحیح کی شاید وہ اپنی غلطی کو فوراً محسوس کر کے اس کی جان چھوڑ دیں۔

اتنی بزدلی بھی اچھی نہیں، باپ نہیں بدلتے۔ وہ مسکرایا۔

یو، بلڈی مین۔ وہ مارے طیش کے بیقابو ہو گئی۔ میرے باپ کا نام سردار مصطفیٰ ہے۔ علی شیر نہیں۔ وہ چیخ کر بولی۔

ہم آپ کو کچھ نہیں کہہ رہے میڈم۔ آپ کو ایسا کا ایسا واپس کر دیں گے۔ حالانکہ۔ خیر۔

اس کے چیخنے کی آواز غالباً بھورے بالوں والے نے سن لی تھی وہ تیزی سے اندر آیا تھا۔

کیا نام ہے تمہارا؟ چمپانزی گہری نگاہوں سے گھورتا ہوا بولا۔

جاند، چاند مصطفیٰ۔ وہ خوف سے نظریں جھکا کر بمشکل بولی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ غلط فہمی میں ماری گئی ہے اور انہیں یقین دلانا نہایت ضروری ہو گیا تھا۔

کیا تم نعیمہ علی شیر نہیں ہو۔؟ علی شیر کی سب سے چھوٹی بیٹی؟ چمپا نزی بیحد سنجیدہ ہو چکا تھا۔

بھئی خوب انصاف ہوا ہے۔ ایک چاند زمین پر ایک آسمان پر۔ بھورے بالوں والا ہنسا۔

چیمپئن۔ مذاق چھوڑو۔ ادھر دیکھو، کیا ہو گیا ہے یہ کہتی ہے اس کے باپ کا نام سردار مصطفیٰ ہے۔ علی شیر نہیں۔

بھورے بالوں والا چونکا۔ علی شیر سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ اس کی بھی ساری شوخی ہوا ہو گئی۔

کہتی ہے، اس کا پھوپھا ہے۔

پھر تو ڈبل ملیں گے، یار کوئین ہمارے نیٹ میں خود آ گری ہے۔ فکر کی کیا بات؟

وہ گرم ہو گا۔ چیمپئن نے اسے ہوشیار کیا۔

نہیں۔ مال ادھر ہی کا ہے۔ ہم نے تو علی شیر کے گھر سے اٹھایا۔ یار حلیہ تو یہی بتایا تھا پھر؟

تم فوراً باس کو خبر دو اور بتا دو دس لاکھ کی ڈیمانڈ دی ہے۔ ادھر خاموشی ہے، کوئی جواب نہیں ہے ابھی تک۔

علی شیر کی مہمان ہے یہ، بیس لاکھ بھی دے گا۔ چمپا نزی گہری سوچ سے باہر آ کر لاپرواہی سے گویا ہوا۔

وہ درد کرتے بازو دبانے لگی۔ دل بری طرح گھبرا رہا تھا مگر وہ خود کو نڈر ثابت کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔

یار چیمپئن۔ علی شیر نے جس زمین کا مقدمہ جیتا ہے۔ اس کی قیمت اندازاً کتنی ہوگی؟

پچیس تیس لاکھ تو ہوگی باس کہہ رہا تھا۔

تو یار ڈیمانڈ پچیس لاکھ ہونی چاہیے تھی کیا ہو گیا ہے باس کو؟

اوہ۔ وہ اب کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔ اف کس ناگہانی میں پھنسی تھی۔

اس میں اور نعیمہ عرف نمو میں بیحد مشابہت تھی۔ تھوڑا سا فرق تھا تو قد میں تھا۔ نعیمہ اس

سے تھوڑی سے لمبی تھی۔

اس کا خوف قدرے کم ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ان دونوں نے سوا جگت بازی کے کوئی اس قسم کی حرکت نہیں کی تھی۔ جو اس کو دہشت سے مر جانے پر آمادہ کرتی۔

چمپانزی باہر چلا گیا تھا۔

اے زمین کے بدنصیب چاند، تمہارے پھوپھا کو تم سے ذرا محبت نہیں۔ وہ تو پوری بات سننے پر تیار ہی نہیں۔

باس کیا بولتا ہے؟

چپ بیٹھو۔ یہ بولتا ہے۔ چمپانزی مسکرایا۔ خوبصورت چہرے کی انتہائی مکروہ مسکراہٹ۔

یار مہمان کو کھانا تو کھلاؤ۔ چیمپئن نے اس کی جانب اشارہ کیا۔

لے آؤ۔

میں نہیں کھاؤں گی کھانا وانا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

ڈرو نہیں آرام سے رہو اپنا تو یہ دھندا ہے یار، تم سے بھی زیادہ حسین حسین چاند یہاں اترتے رہتے ہیں۔

کوئی دس لاکھ کا چاند، کوئی بیس لاکھ کا کوئی پچیس لاکھ کا کوئی تیس لاکھ کا۔

بعض دفعہ ننھے منے تارے بھی اترتے ہیں یہاں۔ وہ تو چاند سے زیادہ قیمتی ثابت ہوتے ہیں۔ پچاس پچاس لاکھ کے۔ اس نے آنکھیں پھیلا کر گویا چاند کو حیران کرنے کی کوشش کی۔ آپ جیسے مہربان ہمیں لاکھوں سے نوازتے ہیں۔ چاندوں کی کوئی کمی نہیں۔ آپ تو ہماری مہمان ہیں جی۔ کتنی دیر کی یہ آپ کے پھوپھا پر ڈیپینڈ کرتا ہے۔ ویسے آج تک اتنا فیاض پھوپھا دیکھا تو نہیں ہے۔ مگر بات تو اب پھوپھا ہی کی عزت کی ہے۔

اگر انہوں نے نہین دیے تو پھر؟ اس میں ایک دم تیزی پیدا ہوئی۔

پھر۔ اس کی آنکھوں کے تاثرات عجیب سے ہو گئے۔ دس لاکھ نہیں تو آپ ہی سہی وہ ہمیں کچھ نہیں دیں گے تو کیا ہوا، ہم انہیں دے دین کے۔ پچھتاوا عمر بھر کا۔ بڑے عزت دار لوگ ہیں جی آپ۔ کیوں چیمپئن؟

اس کا دل کانپ کر رہ گیا۔

چمپانزی باہر چلا گیا۔ چیمپئن سامنے بیٹھ کر گھورنے لگا اس کی بھوری آنکھیں تیر بن کر اس کے وجود میں اتر رہی تھیں۔

اس نے اب تک بیحد ٹھنڈے ذہن سے کام لیا تھا وہ ان کا منہ بھی نوچ سکتی تھی۔ طمانچہ بھی مار سکتی تھی۔

انہوں ے اب تک واقعتاً اس کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا تھا۔ جو وہ کرنے کا موقع حاصل کر چکے تھے۔ اور اختیار و کنٹرول ان کے ہاتھ میں تھا۔

وہ کوئی حماقت کر کے انہیں مشتعل ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

وہ اس بھورے بلے کی بیباک نگاہوں کے جواب میں انجان بیٹھی رہی۔ گو کہ اندر کی حالت بیحد نازک تھی۔

تھوڑی دیر اسی سہمی ہوئی کیفیت میں بیٹھنا پڑا۔ پھر چمپانزی واپس آ گیا تھا۔

کیا ہوا باس؟ کیا کہہ رہا ہے سپر باس؟ چیمپئن کے لہجے میں بچکانہ سی لاپروائی تھی۔

کہہ رہا ہیڈ زن میٹر، مال تو بہر حال ملے گا، کیس تو اسی گھر کا ہے۔

آیئے میڈم آپ کے پھوپھا جان سے آپ کی بات کرائیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا ہے کہ آپ ہماری معزز مہمان بن چکی ہیں۔

وہ بے قرار انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ چیمپئن آگ بڑھا۔

مت چھوؤ مجھے، چل سکتی ہوں میں۔ وہ پھنکاری تھی۔

چمپانزی آگے بڑھ چکا تھا ایک دم پلٹا۔

کیا ہوا؟

کہہ رہی ہیں، ٹچ می ناٹ۔ چیمپئن اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

اوہ۔ اچھا پودا ہوتا ہے یہ۔۔۔۔ گڈ لکنگ (lookinggood)۔

ہا۔ ہاہاہا۔ ہاہا دونوں کا مشترکہ قہقہہ اس کے اعصاب پر پتھر بن کر لگا تھا۔

وہ اسے تنگ سے پیسج میں لے آ۔

چمپانزی نے ریسیور کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے اس طرح ریسیور جھپٹا جیسے بھوکا روٹی

کی طرف بھاگتا ہے۔

ہے۔ہیل۔لو۔ پھوپھا جان آواز سنتے ہی ساری احتیاط دھری کی دھری رہ گئی وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

دوسری طرف سے اسے دلاسا دیا جا رہا تھا مگر اس کو آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ چمپانزی نے ریسیور اس کے ہاتھ میں سے چھین لیا۔

جی سرکار پھر کیا خیال ہے جناب عالی خان کے ہاں تو مہمان کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ سرکار سوچیے۔آپ کا مہمان ہمارے قبضے میں۔

ٹھیک ہے۔اوہو۔ہو۔ٹیک اٹ ایزی۔گرینڈ مین۔اس نے فوراً ریسیور رکھ دیا تھا۔

اسے دوسرا دن تھا مسلسل جاگتے ہوا اور کچھ کھا ہو۔

بمشکل دو نوالے زبردستی اس نے کھائے تھے۔وہ بھی ان کی متعدد دھمکیوں کے جواب میں چہرے پر لحظہ بہ لحظہ مردنی چھاتی جا رہی تھی۔

وہی لیمپ والا اجڈ سا آدمی رات کو اس کے سر پر پہرہ دیتا تھا۔دن بھر وہ اس کے ارد گرد منڈلاتے اور جگت بازی کرتے رہتے تھے۔

؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

گے تو ہم آپ سے اپنا پورا حق وصول کریں گے۔آپ ڈریے نہیں۔فی الحال آپ ہماری امانت ہیں ویسے بھی آپ اچھی خاصی سمجھدار ثابت ہوئی ہیں۔امید ہے، آپ کا سارا خاندان ہی عقل مند ہو گا۔

وہ بڑے اسٹائل سے پائپ پیتے تھے بیحد شاہانہ کروفر کا مظاہرہ کرتے تھے۔

کہیں وال کلاک لگا ہوا تھا اس نے بارہ کے گھنٹے خود گنے تھے۔

لیمپ والا وحشی بہت مستعد بیٹھتا تھا۔کمر سے بندھی بیلٹ سے ہولسٹر جھولتا تھا۔جس میں سے سیاہ رنگ کا وفناک سا ریوالور جھانکتا تھا۔

اس کے علاوہ اس کے فل بوٹ سے خنجر بھی بندھا ہوا تھا۔جو وہ پہلے ہی دن دیکھ چکی تھی یا وہ جان بوجھ کر دکھا چکا تھا۔

اس پر مستزاد دونالی رائفل اس کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔

جب تک وہ ٹہلتی ہرتی، وہ ایک دم پریڈ کے سپاہی کی طرح اٹینشن رہتا۔ البتہ جب وہ بستر پر ہوتی تب بھی وہ رائفل زمین پر ٹکا کر اور دونوں ہاتھوں سے تھام کر سر جھکا کر بیٹھ جاتا۔

وہ مسلسل ٹہل رہی تھی۔

دل بھر بھر آ رہا تھا ایسا لگتا تھا جیسے وہ سب اس پر فاتحہ پڑھ کر بھول چکے ہوں اس کا کوئی نہ رہا ہو۔

معاً اس نے بوٹوں کی آواز سنی، ایسے جیسے کسی نے اونچی جگہ سے چھلانگ لگا کر دوڑ لگائی ہو، لیمپ والا۔ ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔ اور دائیں بائیں دیکھنے لگا تھا، اس کا ہاتھ ہولسٹر پر تھا اور دوسرے ہاتھ سے اس نے رائفل تھامی ہوئی تھی۔

اس نے اس کی منتشر توجہ کا سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فائدہ اٹھایا۔ اور فورادروازہ بند کر دیا۔

بس اس کی سمجھ میں یہی آیا تھا۔ حالانکہ بظاہر اس حرکت کا اسے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اندر یا باہر بہرحال انہی کی قید میں تھی۔

باہر بھاگنے والوں کے قدموں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔ معاً یکے بعد دیگے دو تین گولیاں دروازہ چیرتی ہوئی اندر آئیں۔

؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟

؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟ پڑھنے لگی۔

کتنی دیر تک بھاگنے دوڑنے کی اور گولیوں کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر یک دم سکوت چھا گیا۔

دروازہ کھولو۔ کون ہے اندر؟ ایک بڑی دبنگ سی آواز سنائی دی۔

توڑ دو۔ اور اس حکم کے ساتھ وہ تیورا کر فرق پر آ رہی تھی۔

آنکھ کھلی تو سامنے اماں جان کا شفیق چہرہ دکھائی دیا۔

اس نے ایک دلدوز چیخ ماری تھی۔ اور اماں جان کے گلے لگ کر بری طرح رو پڑی تھی۔

اماں جان کی کیفیت تھی اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ وہ بھی بری طرح رو رہی تھیں۔

اس نے چاروں سمت نگاہ دوڑائی۔ ہر طرف اپنے تھے اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

معا پولیس آفیسر کو دیکھا جوان سب کو ہٹاتا اس کی جانب آ رہا تھا۔

اس نے اس سے بہت سے سوالات کیے جن میں سے اس نے بمشکل دو تین کے جواب دیے۔ آفیسر نے جیب سے ایک تصویر نکالی۔

کیا اسے پہچانتی ہیں؟ اغوا کرنے والوں میں شامل تھا اگر شامل تھا تو اس کے ساتھی اسے کیا کہتے تھے؟ وہ مشینی انداز میں پوچھ رہا تھا۔

اس کے سامنے چمپانزی کی تصویر تھی۔ اس پر دہشت سی طاری ہوگئی۔

اس کا ساتھی اسے چمپانزی اور کبھی باس کہتا تھا۔ اس نے کانپتے ہو بتایا۔

آئی سی۔ آفیسر اپنی کیپ چھوتا ہوا سیدھا ہو گیا۔ تھینکس۔

ممکن ہے آئندہ بھی اپ کو زحمت ہو مگر قانون سے تعاون کرنا مہذب شہری کی ڈیوٹی میں شامل ہے۔ اور بابا جان سے ہاتھ ملاتے ہو مسکرایا۔

آپ اطمینان رکھیے آفیسر۔ بابا جان شکستہ سے انداز میں ہمکلام ہو۔

وہ آنکھیں کھولے ایک ٹک آفیسر اور اس کے ساتھیوں کو جاتے دیکھتی رہی۔

اس کی پھوپھی، نعیمہ، پھوپھا جان، مودی، ذکی سب اس کے اطراف کھڑے ہو تھے۔ اور اس کی سمت عجیب خالی خالی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

کوئی بھی اسے مخاطب نہیں کر رہا تھا ایک ٹک گھورے جا رہا تھا۔

چند ساکت گھڑیوں کے بعد بابا جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

میری بیٹی ٹھیک تو ہے؟

اور اسے جانے کیا کیا یاد آ گیا۔

وہ تاریک کھنڈر۔

وہ معاشرے کے مجرموں کی اخلاق باختہ ارغیر سنسر شدہ گفتگو۔

وہ ایک ایک گھڑی۔

ایک ایک لمحہ چوکس اور چوکنی رہ کر جاگنا۔

وہ ہر آن ایک خوفناک عذاب کو اپنے سر پر مسلط دیکھنا۔

وہ ہر لمحہ کچھ ہو جانے کا دھڑکا۔

اوہ۔اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔

ہاسپٹل میں اس کا چوتھا دن تھا۔

وقفے وقفے سے بیہوشی کے دورے پڑ رہے تھے، جتنا عرصہ ہوش میں ہوتی بیقینی کی کیفیت میں دکھائی دیتی، نہ جانے کیا کیا سوچتی یہاں تک کہ دماغ چکرانے لگتا اور پھر بیخبری کی حالت طاری ہو جاتی۔

آج بابا جان کے سمجھانے اور بہلانے کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔

وہ ٹیک لگا بیٹھی ان کی باتیں سو رسے سنیں۔

وہ کتنی محبت سے کہہ رہے تھے کہ وہ سب ایک بھیانک خواب سمجھ کر بھول جا۔

مگر۔

ہاسپٹل سے باہر آ کر اسے پتا چلا

کہ اگر وہ بھولنا بھی چاہے گی تو دنیا اسے بھولنے نہیں دے گی۔

اسے باہر آ کر ہر شخص متجسس دکھائی دیا۔

ہر کوئی اس سے اس کی آپ بیتی سننے کا خواہش مند نظر آ رہا تھا۔

ہر شخص اپنی استطاعت کے مطابق سوال اپنی آنکھوں میں لیے پھرتا تھا۔

اس کی زندگی اپنی دوشیزگی اور معصومیت کی مہک کے ہمراہ گزرے ہو کل کی طرح ہی تھی۔

وہ کسی فریق ثانی کی قربت میں انکشاف وشعور کی کیسی نئی منزل سے نہیں گزری تھی۔ اس لیے وہ بہت سی عجیب نظروں کے سوالات سمجھنے تک سے قاصر تھی۔

اسے یہ دیکھ دیکھ کر کڑھن سی ہوتی تھی کہ سارے گھر کو چپ سی لگ گئی تھی۔ پھوپھی اور نعیمہ ہنوز گھر میں تھیں۔نعیمہ نے اسے بعد کے تمام حالات بتا۔

کہ اغوا کرنے والوں کا تعلق اغوا و تاوان کے بہت بڑے گروہ سے تھا۔

مگر اسے بامعنی دیگر نعیمہ کو اس گروہ نے منتخب نہیں کیا تھا۔ بلکہ انتقامی کاروائی کے طور پر اس گروہ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔

جس کو تاوان کی رقم بھی ملنا تھی اور معاوضہ بھی۔

انتقامی مرحلہ اس کے پھوپھا خان علی شیر خان کی جیت سے شروع ہوتا تھا۔

بائیس سال قبل ان کی زمین پر جو کئی ایکڑ کے لگ بھگ تھی۔ قبضہ کرلیا گیا تھا۔ غاصب وڈیرا اپنے اثر ورسوخ کیبنا پر مقدمہ الجھاتا رہا۔ پیچیدگی پھیلاتا رہا ڈیڑھ سال قبل وہ قتل ہو گیا۔ قتل عمد تھا۔ قاتل گرفتار کرلیا گیا ورنہ عین ممکن تھا کہ علی شیر کو اس نئے عذاب میں پھنسانے کی کوشش کی جاتی۔

اس کا اکلوتا بیٹا یو کے میں ہوتا تھا۔ باپ کے مرنے کے خاصے عرصے بعد وہ آیا تھا۔ علی شیر نے مقدمے کی فائلیں نئے سرے سے کھلوا دی تھیں۔

بہت سی نزاکتوں سے نابلد ہونے کے سبب وہ اپنے موقف کی مضبوطی ثابت نہ کر سکا۔ علی شیر کے حق میں فیصلہ ہو گیا۔

نیا وڈیرا خوشامدیوں کے جال میں پھنس چکا تھا۔ نمک مرچ لگا کر اس کے جذبات ابھارنے کے لیے داستانیں سنائی گئیں انتقامی جذبہ بیدار کیا گیا۔ اور نتیجے کے طور پر ایک بیگناہ لڑکی

پر زندگی بھاری کردی گئی۔

اس گروہ کے گرد قانونکا دائرہ روز بروز تنگ کیا جا رہا تھا۔ نہایت احتیاط سے پلاننگ ہو رہی تھی نہ جانے کتنے بزنس مین، کتنی لڑکیاں جن کی اخبر میں تشہیر ہر ممکن طریقے سے روکی جاتی اس گروہ کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں جن سے یہ گروہ کروڑوں روپے ہتھیا چکا تھا۔ اس گروہ کا ہیڈ کوارٹر ڈیفینس کی ایک کوٹھی تھی جو خفیہ آلات سے لیس تھی۔

پولیس نے مہینوں کی عرق ریزی کے بعد کامیاب چھاپہ مارا تھا۔ کئی مجرم موقع پر ہی گرفتار ہوا ایک مارا گیا جس کی تصویر آفیسر نے چاند کو دکھائی تھی۔

پولیس کے لیے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

مگر ان کے حصے میں تو صرف ملال آیا تھا

کہ۔

کاش۔ یہ چھاپہ پہلے مارا جاتا تو شاید یہ نہ ہوتا تو ہو چکا۔

اس کی حالت سنبھلتے ہی اس کی پھوپھی واپس ہو گئی تھیں۔ البتہ نعیمہ جس کی شادی اس ہولناک واقعے کی وجہ سے ملتوی کر دی گئی تھی اس کے پاس ہی تھی۔ جو اس کو بہلانے میں مصروف رہتی تھی۔

مگر وہ اسے کیسے اور کب تک بہلاتی ؟

ساری دنیا آنکھیں پھیر رہی تھی۔

کل تک یہی دنیا رنگین اور محبت آمیز تھی۔

ہر سمت محبت کا بحر بیکراں بہتا دکھائی دیتا تھا۔

اب نہ جانے کس کس کونے سے نقاد اور مخالف نکل آتے تھے۔

ہر نظر نا مہربان،

اور ہر دل، دلی کی طرح دور ہو رہا تھا۔

اور اس زلزلے کا طاقتور ترین جھٹکا اس وقت محسوس ہوا جب اس کی حقیقی خالہ بانگ دہل یہ کہہ کر منگنی توڑ گئیں کہ

تبریز کو منظور نہیں۔

اسے یقین نہیں آیا، وہی تبریز جو اس کے سوا کسی کا تصور تک نہ کرتا تھا۔

حد یہ ہوئی کہ کمال اسی لڑکی سے منگنی پر تیار ہو گیا جس کے لیے وہ کئی بار انکار کر چکا تھا۔ اور لگتا تھا کہ ساری عمر شادی ہی نہیں کرے گا۔

بحران کے ان لمحات میں اسے اپنی طاقت کا احساس ہوا۔

وہ تو واقعی بہت ہمت والی ہے، کبھی وہ ایسے وقت کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اور اب یہ وقت جھیل رہی تھی وگرنہ جو کچھ ہوا، اس حساب سے تو سے مر جانا چاہیے تھا۔

شاید اس میں گھر کے افراد کے ہمدردانہ طرز عمل کا بھی دخل ہو جو ہر دم اس کی دلجوئی میں لگے رہتے تھے۔

پندرہ دن کی اذیت ناک گھڑیوں سے دن رات الجھنے کے بعد بہت سی ہمت مجتمع

کر کے وہ دفتر پہنچی تھی۔

سارا دفتر اس کی بیماری اور زرد روئی پر متاسف دکھائی دیا۔

اس کی دوست اور کولیگ امینہ نے بری خبروں کے زمانے میں ایک اور بری خبر کا اضافہ کیا کہ جمشید صاحب کی اہلیہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملی ہیں۔

اتنا بڑا دکھ اس کی زندگی میں در آیا تھا۔

کہ لوگوں کے دکھ اور مسائل اس کے لیے ایک دم غیر اہم ہو گئے تھے۔ دوسرے حالات میں سنتی تو شاید اسے بیحد رنج ہوتا۔

کیا بات ہے مس آپ نے اپنا پروگرام تبدیل کر دیا ہے؟

کیا پروگرام سر۔؟ وہ چونک پڑی

آپ اگست میں ریزائن کر رہی تھیں ہم تو اخبار میں ایڈ دینے کے بعد دو انٹرویز بھی کر چکے ہیں۔ جمشید صاحب نے کاغذوں میں الجھتے ہو سخت مصروف انداز میں اسے بتایا۔

جی سر مین اپنا ارادہ بدل چکی ہوں۔

ہوں۔ وہ بدستور کام میں الجھے ہو تھے۔

اچھی بات۔ بھئی آپ سے نبھاؤ ہو چلا ہے، کام بخوبی چل رہا ہے۔ نئی آئیں گی، ان سے

نئے سرے سے حساب کتاب سیٹ کرنا ہوگا۔ خاصا وقت ضائع ہوتا ہے ان چکروں میں۔ وہ اپنے مخصوص منہمک انداز میں اس سے ہمکلام تھے۔

یس سر۔ پہلے ملازمت میرا شوق تھی اب مجبوری ہے۔ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

اور ہاں بھئی آپ خاصی بیمار ہیں، اب کیسا محسوس کر رہی ہیں؟

وہ جیسے اخلاقیات نباہنے کی خاطر رسمی سے انداز میں پوچھ رہے تھے۔

ٹھیک ہوں سر

ویسے کی ٹربل تھی آپ کو؟ انہوں نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔

نا قابل بیان ہے سر۔ وہ ود پر قابو نہ رکھ سکی اس کی آواز بھرا گئی۔

جمشید صاحب نے چونک کر اس کی سمت دیکھا۔ یک ثانیے کو ساکت رہ گئے۔

یہ چاند مصطفیٰ ہے۔

اس درجہ گہنائی ہوئی۔

لاپروائی سے بنا گئے سادہ انداز کے بال عام سا لباس۔ دوپٹے کی میچنگ بھی ضروری نہیں سمجھی گئی تھی۔ بلیو سوٹ پر ملگجا سا سفید دوپٹہ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے، خشک ہونٹ۔

لگتا ہے آپ سخت بیمار رہی ہیں۔

جی سر۔ وہ فائل اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔

مجھے مستقل نوعیت کی بیماری لاحق ہے۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہو جواب دیا۔ آنکھوں سے چند قطرے بلا ارادہ ٹپک گئے۔

مس مصطفیٰ پلیز۔ تشریف رکھیے۔ جمشید صاحب بیحد سنجیدہ ہوگئے۔

خدانخواستہ۔ اس بیماری کا کوئی نام تو ہوگا؟

آنسوؤں کی طغیانی اندر طوفان اٹھا ہو تھی، ایک لفظ بولنا دشوار تھا۔

میں آپ سے مخاطب ہوں مس جمشید صاحب نے اسے متوجہ کیا۔

اس نے بہت ضبط کیا آخر وہ صبح سید فتر میں اپنی حالت زار کی وضاحتیں کر رہی تیھ۔

زچ ہوگئی اور ٹیبل پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

جمشید صاحب بیچارے گڑ بڑا کر اپنی سیٹ سے کھڑے ہوگئے۔

بی بی۔ وہ مس، مصطفیٰ۔ بات یہ ہے۔ کہ۔ پلیز۔ واقعی ان کیسمجھ میں کچھ نہ آیا تھا شاید انہیں کچھ سوجھا ہوگا۔ تب ہی انہوں نے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی تھی۔

اور وہ ایک دم الرٹ ہوگئی تھی۔

آئی۔ سوری۔ سر۔ وہ شرمندہ سے انداز میں کہہ رہی تھی۔

بی بی۔ کیا کوئی سیریس قسم کی ٹربل ہے؟

جمشید صاحب درحقیقت پریشان ہو چکے تھے۔اس کے رو پڑنے کا بڑا فطری سارد عمل تھا۔

جی سر۔وہ اسی طرح کھڑے کھڑے گویا ہوئی۔

بہت سیریس ٹربل ہے۔ذلت، رسوائی، خواری ملامت، بہت سے نام ہیں اس بیماری کے۔

جمشید صاحب ساکت کھڑے رہ گئے۔لیے دیے رہنے والے صاحب نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔نہایت ہمدردانہ انداز میں۔

اورانٹرکام پرتاکید کیا کہ وہ مصروف ہیں،انہیں ڈسٹرب نہ کیا جا۔

اتنی گنجائش۔؟

شاید۔اس لیے کہ وہ ذہین اور محنتی کارکن تھی۔

شاید اس لیے کہ وہ بیحد رکھ رکھاؤ والی تھی۔

یا شاید اس لیے کہ ان کی شریک حیات مرحومہ نے بہت اچھے انداز میں اس کا ذکر کئی بار

کیا تھا۔

آپ مجھ پر بھروسہ کرسکتی ہیں مس مصطفیٰ عین ممکن ہے میں آپ کے کسی کام آسکوں۔

وہ اپنی فطری سادگی کے ساتھ اس سے مخاطب تھے۔

کوئی فائدہ نہیں وہ آنکھیں خشک کرتے ہو کہہ رہی تھی۔

بی بی۔یہ نقصان اور فائدے پیش گوئی کے محتاج نہیں ہوتے،آپ ہماری اچھی کارکن ہیں آپ کے کام،آکر مجھے دلی مسرت ہوگی۔

یقین کیجیے۔میں آپ کی پریشانی پر درحقیقت پریشان ہورہا ہوں۔

تب اس نے اپنی ناگہانی جستہ جستہ بتا ڈالی۔

سر آپ ہی بتائیے جس کا کوئی فیوچر نہ ہو،وہ زندگی کا کیا بہانہ ڈھونڈے۔اس نے ٹشو سے ناک رگڑی۔

یہ تو سخت نامیدی ہے مس۔انہوں نے دلاسا دیا۔

سر ہم خاندانی لوگ، اب تو پیچھے کنواں، آگے کھائی ہے سر وہ فائل اور دیگر کا غذاب سمیٹ کر ان کی سمت دیکھے بغیر آگے بڑھ گئی تھی۔

ہیلو۔

جی۔میں چاند کی دادی ہی بات کر رہی ہوں۔

السلام علیکم

وعلیکم السلام

میں جمشید بات کرر ہا ہوں۔جے اینڈ جے انٹر پرائز ز کا جی،ایم مس چاند مصطفیٰ

میں سمجھ گئی۔اماں جان نے بات کاٹ دی۔

آپ کا گھرانہ جس سانحے سے گزرا مجھے اس پر دلی افسوس ہے۔

اللہ کی مرضی،قسمت کا لکھا تھا جمشید صاحب وہ سرد آہ کے ساتھ بولیں۔

درحقیقت یہ واقعہ بہت بڑا ہے،شاید کسی گھرانے کی جواں مرگ سے بھی زیادہ اہم اس

قسم کے سانحات کے بعد لوگ نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں۔

مجھے خدشہ ہے کہ مس مصطفیٰ خودکشی نہ کرلیں خوانخواستہ۔یہ میں ان کی ذہنی حالت دیکھتے ہو کہہ رہا ہوں آپ ان کا خصوصی دھیان رکھیے،اگر چہ یہ بہت احمقانہ سی تاکید ہے۔ظاہر ہے، آپ سیز یادہ۔

آپ کا بہت بہت شکریہ۔اماں جان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

نہ جانے کس خطا کی لپیٹ میں آئے ہیں ہم۔

معاشرے کے یہ ناسور۔کاش ان کو احساس ہو سکے کہ اپنی عارضی تسکین کے لیے وہ

کتنے زندہ اور کارآمد انسانوں کا خون پیتے ہیں۔

جی،آپ نے ٹھیک کہا۔

دیکھیے،اپ پہلی فرصت میں ان کے لیے کوئی پر خلوص ساتھی تلاش کیجیے۔ان کی پارسائی کا یقین ان کو واپس مل جاتو یہ بہت جلد نارمل ہو جائیں گی۔

آہ اماں جان کی آنکھیں بھر آئیں۔

کبھی وہ وقت تھا کہ میں اس کے لیے آنے والے رشتوں سیعا جز تھی۔ ہر دوسرا شخص اسی نیت سے گھر میں داخل ہوتا تھا۔اور آج ؟

جمشید صاحب نے ان کو تسلی دلا سا دے کر فون بند رکھ دیا تھا۔

نکاح کے بعد وہ بیقینی کیفیت میں تھی۔

اسے یقین نہیں ارہا تھا کہ ایک قعرز انسان نے اسے اپنایا ہے۔

اس کی نخوت کا شیشہ چھنا کے سے ٹوٹا تھا۔

سارے حسین خوبصورت، گورے، بھورے معیار چکنا چور ہو تھے۔

اس کی نظروں کے سامنے وہ خوبصورت شیطان ناچ رہے تھے۔جن پر باطنی خباثت کا اجارہ تھی۔

اور یہ شخص۔جسے بلیک باس کا خطاب دے کر اس نے نہ جانے کتنوں کے سامنے ٹھٹھا کیا تھا۔

دنیا کے سنہرے انسانوں میں سے، ایک ثابت ہوا تھا۔

کبھی علقمہ جیسی مایوس عورت کے لیے سر خوشی اور امید کی روشنی۔

کبھی چاند مصطفیٰ جیسی راندہ لڑکی کو اپنے نام و مقام میں حصہ دینے والا۔

کیا جب تک ہمیں زہریلے تجربات نہیں ہوں گے۔

جب تک ہمیں ٹھکرایا نہیں جا گا۔

جب تک ہم دھتکارے نہیں جائیں گے۔

جب تک ہمارے مفادات کو زک نہیں پہنچے گی۔

جب تک ہمیں حاصل نعمت نہیں چھنے گی۔

ہم ظاہر پرستی میں مبتلا رہیں گے۔

ہم اندر کے عظیم انسان کو اپنی ظاہر پرستی کی بھینٹ چڑھاتے رہیں گے۔

کب تک کردار کا حسن ہماری کور چشمی کی نذر ہوتا رہے گا ؟

کب تک ہم، اندھے۔ کانے، فقطے، ننگے، بھوکے، کم ذات، بدذات، کلو، کلو کہہ کر انسان کی تحقیر کرتے رہیں گے۔

ایک انسان کی کوئی خوبی۔ دوسرے انسان کی شامت کیوں لے آتی ہے؟

ایک کی برتری دوسرے کی جان کا عذاب کیوں بن جاتی ہے؟

نعمت ہضم کیوں نہیں ہوتی؟

اس کے ذہن میں طوفان اٹھ رہے تھے۔

رخصتی نو بجے شب سے پہلے ہی ہوگئی تھی۔

ایک کار میں صرف وہ دونوں تھے۔

کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟ وہ ڈرائیو کرتے ہوشائستگی سے حال پوچھ رہے تھے۔

ایک ماورائی رنگی کی کمی تھی مجھ میں۔ وہ آپ سے ملا ہے۔ وہ سنہرا رنگ جس سے آپ کا خمیر گوندھا گیا۔

وہ سوچ رہی تھی۔ کہنے کی ہمت نہیں تھی

نظریں جھکا کر بلیک باس کی استہزائیہ بازگشت پر پمیشان مسکراہٹ ہونٹوں پر روک کر اس نے بمشکل کہا۔

ٹھیک ہوں۔

اختتام------------------The End